محدث دوراں، افقہ زماں، عالم ربانی

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ

فتاویٰ رشیدیہ اور زیر نظر مجموعہ باقیات فتاویٰ رشیدیہ

چند پہلو اور مختصر معلومات

نور الحسن راشد کاندھلوی

عاصمۃ الہند دہلی کے اس جنوبی [مائل بہ مشرق] خطہ یا علاقہ میں، جس کو دریائے گنگا وجمنا سے گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے، دوآبہ [گنگا جمنا] کہا جاتا ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر، ایسی دس بارہ چھوٹی بڑی بستیاں، یا ایسے قصبات آباد ہیں، کہ جن کا برصغیر ہند کی آخری دور کی، دینی علمی عرفانی کارناموں اور اصلاحی عملی جدوجہد میں بہت بڑا حصہ رہا ہے، ان بزرگوں، علمائے کرام، محدثین ومفسرین، مصنفین اور اہل فضل وکمال کی وجہ سے، اس خطہ کو پوری مسلم دنیا میں ایک احترام اور دینی نسبت حاصل ہے۔ اگرچہ اب وہ چراغ گل ہو چکے ہیں، ان محفلوں کے دمامے ٹھنڈے پڑ چکے ہیں اور بعض بستیوں میں تو یہ جاننے والا بھی کوئی نہیں رہا، کہ فلاں فلاں کون تھے، نہ ان کے اعمال اور طریقہ کار میں دلچسپی باقی ہے، نہ ہی ان کے احوال وسوانح اور علمی ورثہ کو زندہ وتازہ کرنے میں، تاہم ان بزرگوں کی نسبت اور خدمات واثرات کی وجہ سے اب بھی ان بستیوں کا نام، لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں زندہ ہے اور یہاں کے حضرات کی دینی علمی خدمات اور کارنامے، پوری دنیا اور ملت اسلامیہ کے لئے پیغام عمل اور اسوۂ حیات بنے ہوئے ہیں۔

بہر حال ان ہی بستیوں یا قصبات میں سے ایک قصبہ، گنگوہ [Gangoh] بھی ہے، جو مغل دور حکومت سے ضلع سہارنپور کا حصہ چلا آرہا ہے۔ اس قصبہ کی قدیم تاریخ بھی، اس علاقہ کے اور قصبات کی طرح تاریخ کے اندھیروں میں گم ہے۔ ان بستیوں بلکہ پورے علاقہ کی، ماقبل مسلمانوں کی سرگذشت کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ہند روایات

اور دیومالا [Metha Logy] کی رو سے تو اس علاقہ کی بعض آبادیوں [قصبات] کی تاریخ مہابھارت کی لڑائی، یعنی تقریباً ڈھائی تین ہزار قبل مسیح تک جاتی ہے، مگر ان روایات واطلاعات کی تصدیق نہایت مشکل ہے۔

دہلی میں مسلم دور حکومت کے آغاز کے بعد بھی، تقریباً دو صدیوں تک، ان بستیوں اور یہاں کی کسی شخصیت کا، کوئی معتبر تذکرہ وتعارف نہیں ملتا، صرف اس قدر معلوم ہے کہ اس علاقہ میں کوئی باقاعدہ نظام آبادی اور حکومت نہیں تھی، بلکہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، جن کو اس دور کی اصطلاح میں گڑھی [Gadhi] کہا جاتا تھا، اس میں کسی ایک بڑے خاندان کے مختلف قرابت داروں کا علیحدہ علیحدہ نظام ریاست تھا، جو کسی ایک بڑے انتظام سے جڑا ہوا نہیں تھا، ہر ایک زمیندار یا رجواڑہ، اپنی علیحدہ چہار دیواری میں حاکم تھا، نہ باہر کی دنیا سے، ان کے زیادہ روابط کا پتہ چلتا ہے، نہ ہی ان کے نظام اقتدار کے خاص شعبوں اور طریقۂ کار کی خبر ملتی ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ان ریاستوں کا تاریخ کے اوراق پر معتبر تذکرہ اور برصغیر کی عہد اسلامی کی تاریخوں میں ان کا نام نہیں آیا۔

اس پورے خطہ میں مسلمانوں کے آنے اور قیام فرمانے کی اطلاعات کا، عموماً آٹھویں صدی ہجری [چودھویں صدی عیسوی ۱۳۰۰ء کے بعد] سے آغاز ہوتا ہے، اس وقت بھی کسی بڑی بستی کے آباد ہونے، یا اس کے متعلق تاریخ کی روایت کا تسلسل نہیں ملتا، بلکہ پیشتر ان روایات کا تعلق اس نواح کی بستیوں اور ان کے اطراف میں موجود، بزرگان دین اور مشائخ کرام سے ہے، جو حکومت اور اقتدار کے ہنگاموں، شہروں کی ترقیات وزینت اور ہجوم خلائق سے یکسو ہو کر، عبادت وریاضت کے خیال سے اس نواح کے گھنے جنگلوں، آبادیوں سے دور مقامات اور چشموں کے کناروں پر پہنچ کر، خاموشی سے قیام فرما ہو جاتے تھے اور اپنے تمام اوقات ذکر وفکر اور یاد الٰہی میں گذارتے تھے، پھر جیسے جیسے ان کے کمالات کی خوشبو مہکتی اور ان کے روحانی زمزموں کی آواز آبادیوں تک پہنچتی، یہ ویرانے آبادیوں میں تبدیل ہو جاتے اور ان حضرات کی جانب مخلوق کی رجوعات کی کثرت، ان بے نام ونشان گوشوں کو، گلستانوں اور قابل قدر آبادیوں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ گنگوہ کے سلسلہ میں بھی اسی قسم کی روایات ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ایک عارف کامل تنہا تشریف لائے، اس وقت یہ جگہ ایک چھوٹے سے راجہ گنگ کی ریاست یا بڑی گڑھی [Badi Gadhi] تھی، جس کی بعد میں مسلمانوں کی ایک جمعیت سے معرکہ آرائی ہوئی، جس میں وہ راجہ مارا گیا، (۱) یوں یہاں مسلمانوں کے آنے، آباد ہونے کا راستہ کھل گیا۔ وقفہ وقفہ سے کئی گھرانے اور مختلف خاندانوں کے

(۱) یہ روایت کسی قدر تفصیل سے، انصار سہارنپور، رامپور ملیباران کے قلمی نسب نامہ میں درج ہے۔ اور لالہ نند کشور [ڈپٹی کلکٹر، ضلع سہارنپور ۱۸۷۰ء] نے بھی، اپنی کتاب "تاریخ سہارنپور" میں نقل کی ہے۔ لکھا ہے:

"مشہور کرتے ہیں کہ زمانہ گذشتہ میں کوئی راجہ گنگ تھا، جس نے اس قصبہ کو اپنے نام سے آباد کیا، ایک قلعہ منہدمہ تعمیر کا نشان اب تک موجود ہے"

تاریخ سہارنپور ص: ۲۵ مطبع مصدر الهدایہ باندہ بلاسندھانی ۱۸۷۷ء۔

اصحاب یہاں آتے اور آباد ہوتے رہے، اسی میں وہ ایوبی، انصاری خاندان بھی تھا، جس کا ہندوستان میں سرسل [Sarsil] (۱) سے عروج وفروغ ہوا، اس خاندان کے چند افراد سرسل سے ترک اقامت کرکے، سہارنپور آئے سہارنپور سے اسی گھرانہ کی ایک شاخ رامپور منتقل ہوئی، گنگوہ رامپور کے قریب ہے۔ دونوں بستیوں کے خاندانوں میں، رشتہ داریوں کی نسبت قائم ہوئی، دونوں خاندانوں میں عزیزانہ تعلقات اور قرابت داری کا سلسلہ ہمیشہ رہا۔ حضرت مولانا گنگوہی کے دادا، قاضی پیر بخش تک یہ شاخ بھی رامپور میں رہتی تھی مگر قاضی پیر بخش اپنے ماموں، شاہ قطب علی کی گنگوہ میں، سخت مخالفت ومخاصمت کی وجہ سے، رامپور ترک کرکے گنگوہ آگئے تھے۔ قاضی پیر بخش کا گنگوہ میں نکاح ہوا، اور تین فرزند تولد ہوئے، ان میں سے ایک، مولوی ہدایت احمد [حضرت مولانا گنگوہی کے والد ماجد] تھے۔

اس خانوادہ کے رامپور [منیہاران] سے گنگوہ منتقل کا سبب، آنے والے اصحاب ان کا دور اور اس سلسلہ کی معلومات مفقود ہیں، بصرف شجرۂ نسب کی چند کڑیاں یا واسطے معلوم ہیں، جو اس طرح ہیں:

شجرۂ نسب حضرت مولانا رشید احمد بن مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسن بن قاضی غلام علی بن قاضی اکبر بن قاضی محمد سالم انصاری۔

یہ کل سات واسطے ہوئے، جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاضی سالم گیارہویں صدی ہجری کے اوائل [سولہویں صدی عیسوی کے آخر] میں حیات ہوں گے، قاضی سالم کے اجداد، سلسلۂ نسب اور دیگر تفصیلات دستیاب نہیں۔

والد ماجد حضرت مولانا کے والد، مولانا ہدایت احمد، عالم فاضل، صاحب نسبت شخص تھے، خانوادہ ولی اللہی کے علماء [غالباً شاہ محمد اسحاق سے؟] تلمذ تھا، حضرت شاہ غلام علی نقشبندی سے سلوک طے کیا اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔ (۲)

---

(۱) سرسل پرانے ضلع میرٹھ اور موجود ضلع باغپت میں، بڑوت سے میرٹھ جانے والی سڑک پر، موضع بنولی اور جوہڑی کے درمیان، سڑک کے کسی قدر فاصلہ پر واقع تھا، جو کسی حادثہ میں یکلخت برباد ہوگیا تھا، ایک بڑا ٹیلہ اس کی نشانی موجود ہے، اور اس کے ذرا دور، اس خاندان کے جد امجد شیخ جلال الدین کا مدفن ہے۔ اس نواح کے متعدد انصاری خاندانوں کا سلسلۂ نسب شیخ جلال الدین سے وابستہ ہے، تفصیلات کا یہاں موقع نہیں، اس خاندان، اس کی ذیلی شاخوں اور ان کے انساب کی تصحیح وتحقیق میں، اسی خانوادہ سے وابستہ جناب سمیع الدین صاحب [اکبرآباد ضلع بجنور، یوپی، ریٹائرڈ انجینئر حال مقیم علی گڈھ] نے وسیع مطالعہ اور تحقیقات کی ہیں اور اس انصاری خاندان پر، سمیع الدین صاحب کی تفصیلی کتاب، زیر طباعت ہے۔

(۲) تذکرۃ الرشید ص: ۱۰، حصہ اول، [طبع اول۔ بلالی اسٹیم، ساڈھورہ] مولانا ہدایت احمد کی شاہ غلام علی سے خلافت واجازت کی، اگرچہ تذکرۃ الرشید وغیرہ میں صراحت ہے مگر ھو الغنی [تکملہ مقامات مظہری] تالیف: حضرت شاہ عبد الغنی مجددی، میں حضرت شاہ غلام علی کے خلفاء کی جو مفصل فہرست ہے، اس میں مولانا ہدایت احمد کا نام درج نہیں۔ ملاحظہ ہو: ہوالغنی از ص: ۱۵۸ تا ص: ۱۸۰ [مطبع احمدی، دہلی: ۱۲۶۹ھ] لیکن اور بھی مختلف تذکروں میں شاہ عبد الغنی کے بعض اور خلفاء کے نام بھی ملتے ہیں، ان کا بھی ھو الغنی میں تذکرہ نہیں ہے۔

مولانا ہدایت احمد اول کلکتہ میں سرکاری ملازم تھے، آخر میں گورکھپور آگئے تھے، یہیں بیمار ہوئے، تھوڑی عمر پائی، عین نوجوانی میں، پینتالیس سال کی عمر میں، راہ آخرت اختیار کی، یہ حادثہ ۱۲۵۲ھ [ستمبر، اکتوبر ۱۸۳۷ء] کو پیش آیا، اس وقت حضرت مولانا، سات سال چند مہینہ کے تھے۔ مولانا ہدایت احمد کے دو بیٹے اور تھے، مولوی عنایت احمد اور سعید احمد۔

ولادت وطفولیت حضرت مولانا کی ۶/ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ [۱۱/مئی ۱۸۲۹ء] کو آبائی مکان، محلہ سرائے گنگوہ میں پیدائش ہوئی، والدین کی نیکی، دینداری اور سلامت طبع کی وجہ سے، حضرت مولانا بھی بہت کم سنی سے، اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ خود حضرت مولانا نے ایک موقع پر فرمایا:

''حق تعالیٰ نے طفولیت ہی میں مجھے وہ یقین عطا فرمایا تھا، کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور جمعہ کا وقت آجاتا، تو کھیل چھوڑ کر چلا آتا اور لڑکوں سے کہہ دیتا تھا، کہ ہم نے اپنے ماموں صاحب سے سنا ہے کہ تین جمعہ کا چھوڑنے والا، منافق لکھا جاتا ہے''(۱)

ابتدائی تعلیم اور ان کے استاذ قرآن خوانی کی ابتدا، گنگوہ کے ایک معروف معلم قرآن، میاں جی قطب شاہ گنگوہی سے ہوئی، غالباً قرآن کریم کی تعلیم وتکمیل، اسی مکتب ومعلم کے روبرو ہوئی، پھر حضرت مولانا کے ماموں، مولوی محمد تقی صاحب جو کرنال میں رہتے تھے، اپنے ساتھ کرنال لے گئے، فارسی کی اعلیٰ درسیات گنگوہ کے ایک اور عالم، مولانا محمد غوث (۲) سے پڑھیں فارسی کے بعد ددھیالی وطن، رامپور (منیہاران) بھیج دئے گئے، وہاں مولانا محمد حسن صاحب سے جو جید فاضل تھے، فارسی کی تکمیل کے بعد عربی درسیات شروع ہوئیں، جب بات ہدایۃ النحو تک پہنچی تو استاذ مکرم [مولانا محمد حسن] (۳) نے عزیز شاگرد کو، دہلی جانے اور وہاں کے جلیل القدر استاذوں سے استفادہ کرنے اور پڑھنے کا شوق دلایا، حضرت مولانا ۱۲۶۱ھ میں تعلیم کے ارادہ سے دہلی پہنچے۔ (۴)

دہلی میں مولانا احمد الدین پنجابی جہلمی سے، ہدایۃ النحو کے درسیات کی ابتدا کی (۵) نحو صرف کی چند اور کتابیں مولانا

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص: ۴۳، حصہ اول

(۲) مولانا شاہ محمد غوث گنگوہی اپنے عہد کی ایک معروف شخصیت اور شیخ طریقت تھے جو شاہ محمد رمضان ''ہادی ہریانہ'' شہید ۱۲۴۰ھ کے خلیفہ مجاز تھے۔ ہادی ہریانہ تالیف پروفیسر منظور الحق صدیقی ص ۱۲۸ (لاہور ۱۹۶۳ء) مولانا محمد غوث کی تعلیم وارشاد پر چند خودنوشت تحریریں اور افادات ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

(۳) تذکرۃ الرشید، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص: ۲۶ ج ۱، اور اختر بہشت، مولوی اللہ بخش کامل چاندپوری ص: میں یہ نام محمد بخش تحریر ہے، مگر تذکرۃ العابدین سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح نام محمد حسن ہے، ملاحظہ ہو: تذکرۃ العابدین ص ۵۳ [دہلی ۱۳۳۳ھ] مولانا محمد حسن کے مفصل تعارف کے لئے دیکھئے راقم سطور نور الحسن راشد کاندھلوی کی تالیف ''تذکرۃ استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی''

(۴) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تعلیم کے لئے دہلی روانگی کا سنہ عموماً ۱۲۶۰ھ نقل کیا جاتا ہے، جو صحیح نہیں ہے [راقم اپنی تالیفات میں اس کی وضاحت کر چکا ہے] یہ سنہ اصولاً ۱۲۶۱ھ ہی ہونا چاہئے، لیکن حضرت مولانا گنگوہی کے دونوں سوانح نگاروں نے ۱۲۶۱ھ ہی نقل کیا ہے اس میں بظاہر کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۵) تذکرۃ الرشید ص: ۲۶، اختر بہشت ص: ۲۷ حصہ چہارم [میرٹھ: ۱۹۱۰ء]

کریم بخش پنجابی کی خدمت میں اخذ کیں اور ان کتابوں پر ایسی دسترس ہوگئی تھی کہ ایک موقع پر مولانا کریم بخش صاحب نے علم کے دعوے دار، ایک ولایتی صاحب سے مقابلہ کے لئے بھیجا، حضرت مولانا کی لیاقت کا کمال تھا کہ وہ شخص جو بڑے علماء سے متاثر نہ ہوسکا تھا، اس کو حضرت مولانا نے مبہوت ولاجواب کردیا(۱) غالباً نصاب درسیات کی متوسطات مکمل کرنے کے بعد، حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعلیٰ کتابوں تک درسیات کا خاصا حصہ، حضرت استاذ الکل سے مکمل کیا۔

اسی زمانۂ تعلیم وتدریس میں حضرت مولانا محمد قاسم سے قریبی تعلقات ہوئے، وطن اور خاندان کی قربت اور تعارف کی وجہ سے، دونوں سے آپس میں نہایت گہرے، ایسے تعلقات ہوگئے تھے، جو پوری زندگی جاری رہے۔

حضرت مولانا مملوک العلی کے علاوہ، مولانا شاہ احمد سعید مجددی [والد ماجد حضرت شاہ عبدالغنی] مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی، حضرت مولانا کے بڑے اساتذہ میں شامل ہیں۔ شاہ عبدالغنی کے علاوہ حضرات سے کس وقت کس قدر اور کتنے عرصہ تک تلمذ واستفادہ کیا، کس سے کون سی کتابیں یا علوم وفنون پڑھے اور ان میں کون کون صاحبان، حضرت مولانا گنگوہی کے رفیق وہم سبق تھے۔ افسوس ہے کہ اس کی تفصیلات دریافت نہیں۔ تاہم حضرت مولانا گنگوہی کے مختلف ارشادات اور بعض تحریرات وفتاویٰ کے ضمنی اندراجات سے، ان تمام حضرات سے باقاعدہ تلمذ اور استفادہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم کے ہم سبق ہونے کی روایات؟ ان دونوں حضرات کے احوال وتذکروں میں عموماً نقل کیا جاتا ہے، کہ یہ دونوں حضرات گویا شروع سے آخیر تک، تمام کتابوں میں رفیق وہم درس تھے، یہ روایت صحیح نہیں۔ حضرت مولانا مملوک العلی کے یہاں ممکن ہے کچھ کتابیں ساتھ پڑھی ہوں، یا دہلی کالج میں ساتھ امتحان دیا ہو مگر اور کتابوں میں ہم درس ہونے کی تصدیق مشکل ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی کے دونوں بڑے استادوں، مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا شاہ سعید احمد مجددی سے، حضرت مولانا نانوتوی کا تلمذ ثابت نہیں اور اس کی بھی کوئی شہادت دستیاب نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی، شاہ عبدالغنی کے یہاں درس حدیث میں، حضرت مولانا محمد قاسم کے رفیق تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی نے دہلی میں صرف چار سال گذارے، مولانا عاشق الٰہی کی اطلاع کے مطابق، عمر کے اکیسویں سال، تقریباً ۱۲۶۵ھ [۱۸۴۹ء] میں تعلیم سے فارغ ہوکر وطن واپس آگئے تھے مگر حضرت مولانا نانوتوی کی تعلیم سے فراغت کا سن حتمی طور پر معلوم نہیں، بہ ظاہر اس کے بعد کا ہے، اس لئے دونوں کو ہم سبق کہنا اور لکھنا صحیح نہیں۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: تذکرۃ الرشید ص: ۱۸۰ حصہ دوم

تلاش معاش، ملازمت اور تجارت کتب حضرت مولانا تعلیم سے فارغ ہوکر واپس آنے کے بعد، کچھ دنوں وطن میں رہے، بعد میں سہارنپور میں نواب شائستہ خاں کے یہاں [قلعہ نوابان میں] ملازم ہوگئے تھے، شاید دس یا بیس روپے [ماہانہ] تنخواہ تھی، خود ایک موقع پر، حضرت مولانا نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے اس زمانہ میں عربی پڑھے ہوؤں کی بڑی قدر تھی، منصفی اور صدرالصدوری وغیرہ وغیرہ بڑے بڑے عہدے ملتے تھے، چنانچہ ہمارے ساتھ کے پڑھے ہوئے اکثر لوگ بڑے بڑے عہدوں پر نوکر ہوئے۔ ماموں صاحب نے میرے لئے بھی سعی کی، مگر میں نے منظور نہیں کیا، اس پر ماموں صاحب ناخوش ہوئے، جب وہ سمجھ گئے کہ یہ انگریزی نوکری ہرگز نہ کرے گا، تو انہوں نے مجھے بہت ہی مجبور کیا اور ایک رئیس کے ہاں تعلیم پر نوکر کرادیا، ماموں صاحب کی سفارش سے وہاں خوب قدر وعزت ہوئی مگر ہم چند ہی روز میں نوکری چھوڑ کر چلے آئے، آخر ماموں صاحب سمجھ گئے کہ اسے کچھ کرنا نہیں ہے، پھر مجھ سے کچھ نہ فرمایا اور ناخوش بھی نہیں ہوئے" (۱)

ملازمت چھوڑنے کے بعد، تصنیف وطباعت کا کام شروع کیا تھا، اس وقت سے وطن میں رہے، حضرت مولانا کی کتابوں میں سب سے پہلی دستیاب تالیف، نصیحة الشیعہ ہے، اس کے آغاز پر، حضرت مولانا نے اپنے لئے "ابومحمود کتب فروش" کی نسبت تحریر فرمائی ہے، یہ کتاب جمادی الاخریٰ ۱۲۸۸ھ [اگست ۱۸۷۸ء] کی تالیف ہے، اگرچہ کوئی تحریری شہادت دستیاب نہیں مگر خیال ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کو کتابوں کی تجارت واشاعت یا کسی اور کاروبار سے، اچھی آمدنی اور یافت ہوئی ہوگی، اس لئے اسی سال حضرت مولانا نے حج اسلام ادا کرنے کا ارادہ فرمالیا، اگرچہ اس کے اکثر مصارف حضرت کے ایک خاص محب اور عزیز نے اپنے ذمہ لے لئے تھے، (۲) اس سفر کے بعد، حضرت مولانا فکر معاش سے بالکل یکسو ہوگئے تھے، اور سفر حج سے واپسی کے بعد اور کتابوں کے علاوہ، درس حدیث خصوصاً صحیحین اور اعلیٰ کتابوں کا درس شروع فرمادیا تھا۔ مؤلف نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے:

---

(۱) یہی حضرت مولانا تھانوی کے ایک ملفوظ میں ہے:

"مولانا گنگوہی ایک مدت تک شائستہ خاں کے قلعہ میں [سہارنپور میں] تھے، شاید دس یا بیس روپے تنخواہ تھی۔ میں اب جو سہارنپور گیا تھا [لاہور سے] واپسی کے موقع پر، تو وہ حجرہ دیکھ آیا ہوں، جس میں مولانا کا قیام تھا، یہ لوگ مولانا کی بہت خاطر کرتے تھے"

جمیل الکلام مجموعہ ملفوظات، شامل الفضل للوصل ص ۹، ۳ شعبان [لکھنؤ ۱۳۵۷ھ]

(۲) پہلے حج کی تفصیلات، منازل سفر اور حقائق کا حضرت مولانا گنگوہی نے اپنے متوسلین، حافظ اللہ دیا بیگ کاندھلوی اور مرزا الٰہی بخش گورگانی، دہلوی ثم کاندھلوی کے نام خطوط میں تذکرہ کیا ہے، یہ تفصیلات کہیں اور نہیں ملتیں۔ راقم سطور نے ان مکتوبات کو اردو ترجمہ اور حواشی وغیرہ کے ساتھ مرتب کرکے ہم کاتب کے نام سے شائع کروا دیا تھا، جس کے تین ایڈیشن ختم ہوچکے ہیں، فی الوقت کمیاب ہے۔

"وكان قبل سفر الحجاز في المرة الثالثة يقرئ في علوم عديدة من الفقه والاصول والكلام والحديث والتفسير، وبعد العود من الحجاز في المرة الآخرة أفرغ أوقاته لدرس الصحاح الستة، والتزم أن يدرسها في سنة واحدة، وكان يقرئ جامع الترمذي أولا، ويبذل جهده فيه في تحقيق المتن والإسناد، ودفع التعارض وترجيح أحد الجانبين، وتشييد المذهب الحنفي، ثم يقرئ الكتب لا اخر سنن ابي داؤد فصحيحي البخاري ومسلم فالنسائي وابن ماجة سردا، مع بحث قليل فيما يتعلق بالكتاب".(۱)

ترجمہ: حج کے تیسرے سفر سے پہلے مختلف علوم وفنون، فقہ، اصول، کلام، حدیث وتفسیر کا درس دیتے تھے مگر اس آخری حج کے بعد، اپنے تمام اوقات صحاح ستہ کے درس کے لئے فارغ کر لئے اور اس کا اہتمام کیا کہ ان سب کو ایک سال میں پڑھادیں [اور اس میں ترتیب یہ تھی] سب سے پہلے سنن ترمذی پڑھاتے تھے اس کے متن اور سند کی تحقیق میں، روایات کے اختلافات کو دور کرنے اور ایک جانب کو ترجیح دینے اور مذہب حنفی کے ثابت کرنے میں، اعلیٰ درجہ کی کاوش فرماتے تھے، پھر اور کتابیں پڑھاتے تھے، خصوصا سنن ابوداود پھر صحیح البخاری اور صحیح مسلم۔ پھر نسائی پھر ابن ماجہ۔ روایت کے طور پر، جس میں صرف متن کتاب کے حوالہ سے قلیل گفتگو فرماتے تھے۔

درس وتعلیم کی ابتداء اور پہلے شاگرد اس دور کے طالب علم، اپنے زمانہ تعلیم وتدریس سے ہی اس کام میں لگ جانے کی کوشش کیا کرتے تھے، جس کے لئے وہ خود اساتذۂ کرام کی خدمات میں حاضر رہتے تھے، یہ درس وتعلیم اور دین وشریعت کے مختلف گوشوں کی، حسب لیاقت واستطاعت خدمت اور اس کے کارواں اور عمل کو آگے بڑھانے کی بات ہوتی تھی، حضرت مولانا گنگوہی نے بھی یہی کیا۔ حضرت مولانا، دہلی کے زمانہ تعلیم میں، اوسط اور درمیان درجہ کی کتابوں کی تعلیم اور اسباق کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، ایسے موقعوں پر طالب علموں کی تعداد محدود ہوتی ہے اور عموماً اپنے سے بڑے درجہ میں پڑھنے والوں سے، خاندانی عزیز اور بہت قریبی لوگوں کے بچے بھی پڑھتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی معمول اور روایت کے مطابق، حضرت مولانا کی طالب علمی کے دوران، جس طالب علم نے حضرت مولانا کے سامنے، پہلی مرتبہ تعلیم کے لئے کتاب کھولی، وہ مولانا ملا محمود دیوبندی تھے اور عجب حسن توارد ہے کہ مولانا ملا محمود [جو حضرت مولانا نانوتوی کے بھی شاگرد تھے] مدرسہ

(۱) نزهة الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی، رائے بریلوی ص: ۱۳۹، ج: ۸، دائرۃ المعارف حیدرآباد، ۱۴۰۲ھ۔ ۱۹۸۱ء

دیوبند [دارالعلوم] کے سب سے پہلے استاد ومدرس مقرر کیے گئے، ان کے بعد حضرت مولانا کے وہ ماموں زاد بھائیوں، مولوی ابوالقاسم، اور مولوی ابوالنصر گنگوہی کونسبت تلمذ حاصل ہوئی۔ دونوں نے بعد میں مختلف علماء سے درجات علم کی تکمیل کی اور حضرت مولانا سے ہمیشہ رابطہ بنائے رکھا، خصوصاً مولانا ابوالنصر، ہمیشہ حضرت مولانا کے دست وبازو اور ہر اک معاملہ میں، حضرت مولانا کے رفیق وہم قدم رہے۔

حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں، مولانا ملا محمود دیوبندی اور مولانا منور علی [نکوڑ ضلع سہارنپور] کی تعلیم کے لئے رسائی اور حضرت مولانا کا ان کو درس دینا، ایک گنج مخفی کی کلید اور ایک چشمہ علم وحکمت کی دریافت جیسا تھا۔ حضرت مولانا کے اس درس انفرادیت معنویت اور اہمیت، گلوں کی خوشبو کی طرح آہستہ آہستہ عام ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ اس کا شہرہ اور غلغلہ، برصغیر [ہند، پاکستان، بنگلہ دیش] کی سرحدوں سے گذر کر، دور دراز ملکوں تک پہنچا، سینکڑوں باکمال افراد، جید علماء، قابل مدرسین اور برسہابرس سے خدمت ودرس حدیث میں مشغول، اساتذہ اور فاضلان حدیث، حضرت مولانا کی خدمت میں آنے شروع ہوگئے اور اس درس کی معنویت، اس عہد میں بعض خصوصیات میں منفرد ہونے اور اس کے ذریعہ سے احادیث شریفہ کے مفاہیم ومطالب کی ایسی گرہ کشائی اور ان کے حقائق ومقاصد کا ایسا ادراک، جس کی کم سے کم اس دور میں کوئی مثال نہیں تھی، نیز مقاصد حدیث تک پہنچنے اور ان سے گراں بہالعل وگہر تلاش کرنے اور ان کو اہل خرد، ارباب ذوق طلباء، اور عالمان حدیث تک پہنچادینے کی، جو بات اور جو شان اس درس میں پائی جاتی تھی، بلاشبہ نہ صرف اس دور میں اس کی مثالیں معدوم تھیں، بلکہ اس سے پہلے زمانوں میں بھی ایسی وقت نظر، ایسی فہم اور بے نظیر عمق کی دولت، گنتی کے چند اکابر محدثین کے حصہ میں آئی تھی۔ بلاشبہ حضرت مولانا کے قریبی دور اور خود حضرت مولانا کے حین حیات بھی، بڑے بڑے علماء، حدیث کے فاضل اور اصحاب درس وافادہ موجود تھے، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ نیز شاہ عبدالعزیز اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے علاوہ کون ہے، جس کو درایت وفہم حدیث میں، حضرت مولانا کے ہم پایہ کہا جاسکے؟

محدثانہ شان اور فقہائے محدثین میں عالی مرتبہ خدمت حدیث میں، حضرت مولانا کے مقام ومرتبہ بلکہ عالی فہم اور درایت حدیث میں انفرادیت کا متعدد علمائے کرام اور اہل نظر نے، اپنے اپنے انداز سے تذکرہ کیا ہے، اس کے نادر عنوانات شمار کرائے ہیں اور اس کے محاسن واضح کیے ہیں۔[ایک بڑے عالم، مصنف اور محدث [مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں:

"فكان المحدث فقيه هذه العصور الشيخ رشيد احمد الكنكوهي الانصاری رحمه الله، جمع مع العلوم الرائجة علوم ارباب القلوب ووهب نورا فی القلب یلمع به ما اظلم علی

الناس، فكان يأتي بتوجيهات في المشكلات الفقه ومعضلات الحديث، ما خلت عنها الاسفار الضخمة والمجلدات الكبير، وكان موفقا طيلة حياته المباركه لدرس الامّهات الست، طول النّهار غير فترة قليلة في البين، وبقي نصف قرن يدرس الحديث وكتب السنة، لايلحقه ملل ولا ضجر ولاسامة ولاتعب مع اشتغاله بتربية النفوس وتربية القُلوب بالاذكار والتوجه، فكان نفسه الزكية تتجلى كل حين وهذا ماعدا افتاء في النوازل والمسائل.(۱)

ترجمہ: پس فقیہ زمانہ حاضرہ، حضرت شیخ رشید احمد گنگوہیؒ انصاری رحمۃ اللہ علیہ، مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ اہل دل کے علوم کے بھی جامع تھے، انہوں نے دلوں کو ایسا نور بخشا، جس سے لوگوں پر اندھیرا روشن ہوگیا۔ آپ فقہ اور حدیث کے مشکلات کی ایسی ایسی توجیہ فرماتے کہ جس سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی خالی ہیں، آپ اپنی ساری مبارک عمر میں، سارا سارا دن سوائے تھوڑے سے درمیانی وقفے کے، صحاح ستہ کی درس وتدریس کی توفیق سے سرفراز رہے، اور نصف صدی تک حدیث وکتب سنت کی اس طرح تدریس فرماتے رہے، کہ جس سے نہ آپ کبھی شکستہ خاطر ہوئے اور نہ کبھی تھکے، باوجود اس کے کہ آپ کو ذکر کے ذریعے نفوس کی تربیت وقلوب کے تصفیہ اور توجہ کے ساتھ مشغولی ہوتی تھی، پس آپ کا پاکیزہ نفس ہر وقت متجلی رہتا تھا اور یہ کام، حوادث مسائل میں افتاء کے علاوہ تھا، آپ جس طرح کہ ارشاد وتربیت نفوس اور صحاح ستہ کی درس وتدریس کے لئے مرجع خلائق تھے، اسی طرح آپ حوادث کے مشکل مسائل کے بھی مرجع خلائق تھے۔"

حضرت مولانا درس حدیث میں جن نکات وخصائص پر توجہ فرماتے اور جن مسائل ومشکلات کے حل کرنے کی کوشش فرماتے تھے، وہ خود حضرت مولانا کے الفاظ میں درس اور فہم حدیث کا اصل مقصود ہے۔ حضرت مولانا نے ایک مجلس میں اپنے طریقۂ درس کی وضاحت کرتے ہوئے، ارشاد فرمایا:

[حدیث میں] اصل مقصود کی طرف توجہ رہی، اصل مقصود یہ ہے کہ اشکال حدیث کا حل کیا جائے، تعارض رفع کیا جائے، مسئلہ ثابت کیا جائے، تفقہ حاصل ہو، اسی کی طرف میرا خیال رہا۔ حنفی شافعی جو ہوں، اپنا مسئلہ ثابت کریں۔(۲)

(۱) مقدمہ اللامع الدارمی علی جامع البخاری.

(۲) دہلی اور اس کے اطراف [سفرنامہ دہلی دیوبند وگنگوہ وغیرہ] از مولانا عبدالحی حسنی [مؤلف نزہۃ الخواطر] ص: ۱۲۹-۱۳۰] دہلی: ۱۹۵۸ء

حضرت مولانا گنگوہی کے افادات حدیث اور تقاریر درس کو پڑھ کر، سمجھ کر، اور ان سے اخذ واقتباس کر کے، مولانا بنوری نے بھی یہی سمجھا تھا۔ مولانا بنوری نے ایک اور موقع پر لکھا ہے:

''حضرت شاہ ولی اللہ نے تفقہ فی الحدیث کا جو پودا لگایا تھا، حضرت گنگوہیؒ نے اسے تناور درخت بنا دیا، اسی طرح نور باطن اور تعلق مع اللہ سے حدیث سمجھنے کا سلسلہ، حضرت گنگوہی پر ختم ہو گیا۔ حضرت گنگوہی کو اللہ تعالیٰ نے فقاہت نفس سے سرفراز فرمایا تھا، مسلک حنفی کو ادلۂ حدیث سے ثابت کرنا اور جو حدیث بظاہر مخالف نظر آئے، اس کا جواب دینا، حضرت گنگوہی نے اس فریضہ کو کامیابی سے ادا کیا۔ اس کے علاوہ فقہاء حنفیہ متاخرین کی تفریعات جو حدیث کے خلاف تھیں، ان کی فقہ حنفی سے برأت کی، علاوہ ازیں فقہ میں توسع اور تضییق کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی۔ شراح حدیث ابن بطال، مہلب، ابن التین، ابن المنیر، قاضی عیاض، خطابی، ابن حجر، عینی رحمہم اللہ سے بہتر احادیث کی شرح کی۔

الکوکب الدری اور لامع الدراری میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، خصوصاً لامع میں حل تراجم کے سلسلے میں، حضرت گنگوہی کی ایسی توجیہات ہیں، کہ عقل حیران ہے، حافظ ابن حجر اور عینی رحمہم اللہ تعالیٰ کی توجیہات سے فائق ہیں۔ (۱)

مولانا محمد یوسف بنوری نے، ایک سلسلۂ گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ:

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد حضرت گنگوہیؒ وہ واحد شخص ہیں، جنہوں نے محض اپنے نور قلب سے حدیث کی مشکلات حل کی ہیں اور کچھ تھوڑا سا حصہ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی اس سے ملا۔ (۲)

یہ کہنے اور لکھنے والے حضرات وہ ہیں، جو فن حدیث کے غواص، رمز شناس اور بڑے محقق ہیں اور جو بلا تامل یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں

اور اس میں بھی ذرا شک نہیں کہ مولانا بنوری اور ان کے ہم نوا اصحاب کا یہ فرمانا، بلا شک وشبہ درست ہے، حضرت مولانا گنگوہی جیسی دقت نظر اور غواصی حدیث کی سعادت، اور بے نظیر نتائج ومباحث کا استخراج، کس کا حصہ ہے، یقیناً یقیناً لم یسبق مثلہ اس لئے حضرت مولانا کے حدیثی افادات وعلوم دیکھ کر، یہاں غالب کا دوسرا مصرعہ بھی بلا تامل دہرایا جا سکتا ہے:

دیکھیں، اس سہرے سے کہدے، کوئی بہتر سہرا

---

(۱) بنوری نمبر: ص ۱۰۳، ماہنامہ بینات، کراچی: ۱۳۹۸ھ۔ ۱۹۷۸ء

(۲) بنوری نمبر: ص ۱۳۲، ماہنامہ بینات، کراچی: ۱۳۹۸ھ۔ ۱۹۷۸ء

صحیح بخاری، ترمذی وغیرہ کی درسی تقریریں حضرت مولانا کے دروس حدیث کی گراں قدر یادگار، حدیث شریف کی تقریریں اور افادات ہیں، جو حضرت مولانا کے متعدد شاگردوں نے، اپنے اپنے زمانہ تدریس وتعلیم میں محفوظ اور قلم بند کر لئے تھے۔

جس میں سب سے بڑا سرمایہ اور اہم ترین خدمت وہ ہے، جو مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور ان کے رفیق درس اور عزیز مولوی رضی الحسن کاندھلوی نے تحریر ومرتب کی تھی، شیخ حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے، ان افادات یا تقریروں پر نہایت قیمتی فوائد واضافات اور مفصل حاشیوں کا اضافہ کر کے، ان کو اس شان سے شائع کیا، کہ ان میں سے ہر ایک مجموعہ، بڑی شروحات کا قائم مقام اور علم حدیث کے علماء کے لئے، بیش قیمت تحفہ ثابت ہوا۔ صحیح بخاری کے افادات اللامع الدراری کے نام سے سنن ترمذی کے الکوکب الدری کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں اور پوری علمی دنیا میں علمائے کرام اور حدیث شریف کے شائقین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور اپنی بڑی جلدوں اور ضخامت کے باوجود، کثرت سے چھپتے رہتے ہیں۔

حدیث شریف کی شرح، اس کی تفہیم اور مذاہب فقہاء سے اس کی صحیح تطبیق، متعارض احادیث میں وجہ ترجیح اور بعض مطالب کی وضاحت میں، مولانا کی دقت نظر اور غیر معمولی دسترس کا تو حضرت کی درسی تقریروں کے مطالعہ سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے، خصوصاً حضرت مولانا احادیث شریفہ کی جو توجیہات کرتے ہیں اور بعض مطالب بیان فرماتے ہیں، وہ حضرت مولانا کا غیر معمولی امتیاز اور منفرد حصہ ہے، ان توجیہات وشروحات کی وجہ سے ہی، حضرت مولانا کو، امت کے اہم ترین محدثین اور شارحین حدیث میں شمار کیا گیا ہے۔

حضرت کے درسی حدیثی افادات وفرمودات، سب سے پہلے کس نے جمع کئے، راقم کو سراغ نہیں ملا، لیکن جو قدیم ترین مجموعہ افادات معلوم ہے، وہ حضرت مولانا کے ایک شاگرد، مولانا شرف الحق دہلوی کا مرتبہ ومکتوبہ تھا، جو ۳-۱۳۰۴ھ میں قلم بند کیا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک اور مجموعہ جو صحیح بخاری، سنن ترمذی کے درسی افادات وتشریحات پر مشتمل ہے، مولانا فتح محمد تھانوی کا مرقومہ مرتبہ ہے۔ ایک اور مجموعہ مولانا نور محمد پنجابی، نیز مولانا صادق الیقین کرسوی، اسی طرح مولانا مفتی عبدالکریم پنجابی کا بھی تھا۔ ایک مجموعۂ افادات مولانا ماجد علی جونپوری کا مکتوبہ ہے، نیز ایک مجموعہ مولانا حکیم رضی الحسن کاندھلوی کے قلم سے ہے، جو حضرت کے آخری درس حدیث میں شامل اور مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کے عزیز وہم سبق تھے۔ جو تقریریں اور افادات مولانا ماجد علی جونپوری اور مولانا رضی الحسن نے محفوظ کئے تھے، وہی اسی حلقۂ درس میں، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے عربی میں ضبط کئے تھے۔ ان مجموعوں میں سے پہلا مجموعہ، مولانا عماد الدین انصاری شیرکوٹی کی کوشش اور اہتمام سے: نفح الشذی علی جامع الترمذی کے نام سے، مجبوب المطابع دہلی سے ۱۳۴۸ھ میں چھپا تھا۔

یہ مولانا نور محمد پنجابی کی ۱۳۰۹ھ میں لکھی ہوئی تقریر کی نقل تھی، جو مولانا فتح محمد تھانوی کے قلم کی یادگار تھی، ان کے نسخہ سے مولانا سید احمد فیض آبادی نے نقل کیا تھا، تاہم مولانا فتح محمد کی لکھی ہوئی مکمل تقریریں اور مولانا ماجد علی نیز مولانا رضی الحسن کے مکتوبہ افادات ہنوز عام دسترس سے دور اور منتظر اشاعت ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی کے حدیثی افادات اور دقت نظر کا، صحیح عرفان وفیضان اس وقت شروع ہوا، جب مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کے فرزند وسعید رشید، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے، اپنے والد ماجد کے اس قیمتی ورثہ اور اندوختہ کو، اپنی فکر ومحنت اور توجہ کا موضوع بنایا، ایک ایک صفحہ اور سطر پر شایان شان محنت کی، اس کے ناقص کو مولانا رضی الحسن وغیرہ کی تقریروں سے مکمل کیا، اس کے نکات کی وضاحت فرمائی، اس کے خصائص پر مفصل روشنی ڈالی اور ان افادات کو سنن ترمذی اور صحیح بخاری کی شروحات کی صورت میں: الکوکب الدری علی جامع الترمذی اور اللامع الدراری علی صحیح البخاری کے نام سے شائع کر دیا، ان دونوں کی اشاعت کے بعد ہی، حدیث کے اکثر شائقین کو، حضرت مولانا گنگوہی کی محدثانہ جلالت شان، بے نظیر فہم حدیث اور حل مطالب کا علم ہوا۔ اس وقت سے اب تک ان سب کی اشاعت اور ان سے استفادہ کا سلسلہ روز افزوں ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی کا حلقۂ درس حدیث، اگرچہ طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے غیر معمولی وسیع نہیں تھا، ہر اک حلقۂ درس میں پچیس طلباء تو تقریباً ہمیشہ رہتے تھے، یہ تعداد کبھی کبھی بڑھ کر چالیس پینتالیس بھی ہو جاتی تھی، ان کے علاوہ ایسے اصحاب کی تعداد بہت تھی، جو خدمت میں حاضر ہوتے، چند دنوں قیام کرتے اور اوائل یا متون سنا کر، اجازت سے سرفراز ہو کر واپس ہو جاتے تھے۔ دونوں قسم کے فیض یافتگان میں سے بڑی اکثریت یا جماعت وہ تھی، جس نے درس حدیث اور فقہ حدیث کو، زندگی بھر کے لئے خدمت کا محور وموضوع قرار دے لیا تھا، اس وادی میں اپنے استاذ مکرم کے قدم بہ قدم رہنے کی ہمیشہ کوشش کی اور ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی عزت وسربلندی عطا فرمائی، جس کے لئے حضرت مولانا کا نام مزندہ ہے۔

وہی عزت وہی عظمت وہی شان دلاویزی

حضرت مولانا کے شاگردوں کی اس خوبی اور کمال کو، ان سب کے، ایک معاصر، مصنف اور مبصر نے، پوری زندگی دیکھا برتا تھا، اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں، اس کا یوں تذکرہ کیا ہے:

وقد رزقه الله من التلاميذ والخلفاء، ماينذر وجود أمثالهم في هذا العصر، في الاستقامة على الدين، واتباع الشريعة الغراء، ونشر العلم النافع، وإحياء السنن وإصلاح المسلمين، ونفع بهم خلائق لاتحصى بحد وعد.(۱)

(۱) نزہۃ الخواطر ص ۱۵۱، ج ۸۔ [۱۴۰۳ھ۔ ۱۹۸۱ء]

اوران کو حق تعالی نے ایسے شاگرد عطا فرمائے کہ اس دور میں دین پر استقامت، روشن شریعت کے اتباع، علم نافع کی اشاعت سنتوں کے احیاء اور مسلمانوں کی اصلاح میں ان کی مثال نہیں اور ان کے شاگردوں سے اس قدر افراد نے فائدہ اٹھایا ہے، کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

حضرت مولانا کے درس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کرنے اور اس عالی قدر درس گاہ سے، مطالب ومعانی حدیث کا فیضان حاصل کرنے کے لئے، ہزاروں طلبۂ حدیث اور دل دادگان حدیث کی طبیعتیں، بے تاب رہتی تھیں، حاضری کے لئے بے شمار دلوں میں آرزوئیں موجیں مارتی رہتی تھیں، مگر ہر اک کے لئے ممکن نہیں ہوتا، کہ وہ اپنے حالات ومسائل کو ایک طرف رکھ کر، اپنے وسائل اور مالی گنجائش وضرورت کو یکسر نظر انداز کر کے، تعلیم اور خدمت دین کے لئے اپنے گھر اور علاقہ سے نکل سکے، پھر بھی بہت سے اصحاب توفیق، اہل علم وذوق، حضرت مولانا سے استفادہ اور اجازت حدیث کے لئے، گنگوہ حاضر ہوکر اور اپنا دامن مراد حدیث کے علم، فہم مقاصد اور اس پر عمل کے جذبہ سے پُر کرتے ہوئے، واپس ہوتے تھے۔

حضرت کے شاگرد اور مستفیدین کی تعداد، ایک اندازہ حضرت مولانا کی خدمت میں کس قدر طلبا حاضر ہوئے اور اطراف عالم کے کس قدر علمائے کرام اور حدیث کے اساتذہ اور فاضلین نے، اجازت حدیث حاصل کی، اس کی نہ کوئی فہرست موجود ہے، نہ ہی اس کا حتمی شمار ممکن ہے، صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت کے شاگردوں اور مجازین ومستفیدین حدیث کی تعداد، یقیناً ہزاروں میں ہوگی، اس وسعت استفادہ اور کثرت تلامذہ کا، خود حضرت مولانا کی ایک تحریر سے صاف اندازہ ہو رہا ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے پیر ومرشد، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کے نام ایک خط [مکتوبہ ۱۳۰۶ھ] میں لکھا ہے:

"حضرت مرشدمن! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً سات سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے، اس سال (۱۳۰۰ھ) سے اب تک دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی، سند حدیث حاصل کر کے گئے اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں، اگر قبول ہو جاوے۔" (۱)

اس گرامی نامہ میں ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۰۶ھ تک چھ سال کے درمیان کے، تلامذہ اور اجازت حدیث سے مستفید اصحاب کی تعداد کا تذکرہ آیا ہے۔ ۱۳۰۶ھ سے، ۱۳۱۴ھ تک جو حضرت مولانا کے درس حدیث کا آخری سن ہے اور اس وقت سے حضرت کے زمانہ وفات ۱۳۲۳ھ تک، کس قدر علماء، اور اجازت حدیث کے طالب، حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر اور اجازت

(۱) مکاتیب رشیدیہ، مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ص: ۱۰، طبع اول۔ عزیز المطابع۔ میرٹھ بلا سنہ

وسند حدیث سے مشرف ہوئے ہوں گے، ان کا واضح تذکرہ بلکہ شمار بھی نہیں ملتا، مگر یہ تعداد کسی طرح بھی سوا دو، ڈھائی ہزار سے کم نہیں ہوگی اور یہ جُرعہ نوشانِ حدیث نبوی وہ تھے، جنہوں نے یہاں سے جانے کے بعد خود کو اسی نظام سے، اسی تعلیم سے، اسی پر عمل سے اور اسی کی تربیت سے وابستہ کیا۔ یوں یہ سلسلہ درس وافادہ جو حضرت مولانا کی ذات گرامی سے ایک دو طالب علموں کی صورت میں شروع ہوا تھا، دریائے بے پایاں کی صورت میں جاری ہوا، جس کا اثر اور بڑا اور بہت بڑا فیضان، اس طرح عام ہوا، کہ اس وقت شاید دنیا کے کم سے کم آدھے حصہ میں، اس سے فیضیاب افراد موجود ہیں اور یہ سلسلہ دم بدم آگے بڑھ رہا ہے۔ اللھم زد فزد۔

فقہ میں عالی مرتبہ اور شانِ تفقہ حضرت مولانا کی ذات گرامی علم وفیضان کے جو چشمے جاری ہوئے، ان میں حدیث نبوی شریف کے بعد، سب سے بڑا اور اہم ترین عنوان، فقہ وشریعت کی اس عہد میں گویا عدیم النظیر واقفیت، اس کے اسرار ومقاصد کی گرہ کشائی، مسائل فقہ کی غیر معمولی تحقیق، جو مسائل حدیث سے ثابت ہیں ان کے دلائل پر پوری نظر اور جو حدیث صحیح کے خلاف ہیں، ان کی واضح نشاندہی۔ فقہ ائمہ اربعہ کے مآخذ ومنابع کی گہری بصیرت اور ان کی قوت وکمزوری کا مبصرانہ علم، سب سے بڑی بات جو حضرت مولانا کو اس دور اور بعد کے تمام اہل فقہ ممتاز کرتے ہوئے، اکابر فقہاء اور متقدمین کی صف میں شامل کرتی ہے، وہ فقہائے احناف کے دلائل سے، کامل فنی گہری واقفیت کے ساتھ، اختلاف واتفاق ہے۔

حضرت مولانا کلیدی مسائل میں، کسی بھی مسئلہ کو صرف اس لئے قبول نہیں کرتے اور ترجیح نہیں دیتے، کہ وہ ہمارے علماء اور اہل فتویٰ کی رائے یا تحقیق ہے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس رائے کے پیچھے دلائل وماخذ کا جو سرمایہ ہے، وہ کیسا ہے، کیا اس میں واقعۃً حقیقی استدلال کی شان، منبع وماخذ بننے کی صلاحیت اور اس کی مدد سے اصول وکلیات وضع کرنے کی بات پائی جاتی ہے یا نہیں، اگر یہ تمام دلائل اور نتائج تحقیق اس نظریہ کی تائید میں ہوتے ہیں، تو حضرت مولانا اس کی تائید فرماتے ہیں اور اس کو اہل فقہ اور ارباب تصنیف کی طرح، اپنے اصول ومنابع میں شامل رکھتے ہیں اور اگر معاملہ اس کے خلاف ہے، کہ ان اصول ومسائل کے دلائل، تحقیق کی ترازو اور کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، تو ان سے اسی قدر صاف اختلاف بھی فرماتے ہیں۔ یعنی اس سلسلہ میں حضرت کا ذوق علم اور بصیرت وکمال صاف یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ:

جہاں بنی میری فطرت ہے، لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

بعد میں اہل نظر نے اس کی تصدیق کی، کہ حضرت مولانا کا کسی سے بھی اتفاق واختلاف، بلا وجہ اور صرف اختلاف واتفاق کے لئے، کبھی نہیں ہوتا تھا۔ حضرت مولانا ہر اک مسئلہ اور بحث کے لئے، حدیث شریف کے کامل سرمایہ، اصول وکلام

کے جملہ مباحث، فقہائے اربعہ کے جملہ دلائل اور فقہ حنفیہ کے ائمہ کی تحریرات وکتب پر وسیع نگاہ رکھتے تھے، ہر چند کہ حضرت مولانا نہایت جامع، نہایت مختصر بات فرماتے ہیں، بہت کم ایسا ہوتا کہ دلائل اور وجوہات کا تذکرہ فرماتے ہوں اور فقہاء اور مآخذ کی عبارتیں نقل فرماتے ہوں، مگر جاننے والے جان لیتے ہیں کہ یہ جو کچھ فرمایا جارہا ہے اس کے لئے نہایت مستحکم بنیادیں موجود ہیں۔

حضرت مولانا کی اسی گہرائی فکر، دقت نظر اور اندرون بینی کی وجہ سے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری جیسے، علامۂ زماں اور بحر علوم نے [قادیانیوں سے متعلق مقدمہ میں] بہاولپور کی عدالت میں فرمایا تھا:

"ویسے ہمارے نزدیک حضرت شاہ عبدالعزیز، علامہ شامی سے فقیہ ہیں اور حضرت گنگوہی کو بھی ہم نے، شامی سے فقیہ النفس (۱) پایا" (۲)

یہی بات حضرت علامہ نے حضرت مولانا گنگوہی پر اپنے قصیدہ میں فرمائی تھی، کہتے ہیں:

لقد فرع الورى عملاً وعلماً ... مكارم ساعدت كرم النجار
إمام قدوة عدل أمين ... ونور مستبين كالنهار
فقيه حافظ علم شهير ... كصبح مستنير هدى سار
إليه المنتهى حفظاً وفقهاً ... وأضحى في الرواية كالمدار
ففي التحديث رحلة كل راو ... وفي الأخبار عمدة كل قاري
فقيه النفس مجتهد مطاع ... وكوثر علمه بالخير جاري
وأحي سنة كانت أميتت ... وإذ وضح النهار فلا تمار (۳)

---

(۱) انوار انوری (مجموعہ افادات ملفوظات علامہ انور شاہ کشمیریؒ) تالیف مولانا محمد انوری ص:۵۰، (لائل پور، ۱۳۶۸ھ)

(۲) فقیہ النفس فقہاء کی ایک اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرت ممارست کے بعد، ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو، جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا ہو۔۔۔ "میرے والد میرے شیخ" تالیف: مولانا تقی عثمانی صاحب ص:۵۸ (دہلی: ۱۹۹۵ء)

اس کے بعد مولانا تقی عثمانی جیسے بڑے فقیہ اور جلیل القدر عالم نے، یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

"مجھ جیسے بے علم و عمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ، کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے، کیونکہ فقیہ النفس کی پہچان بھی انہیں لوگوں کا حصہ ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تبحر علمی سے نوازا ہو۔ چنانچہ اس پہچان کے لئے، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری جیسے انسان کی ضرورت ہے۔" (میرے والد میرے شیخ ص:۵۸)

مگر آج کل اور اسلامی اصطلاحات وخطابات کی طرح، لفظ فقیہ النفس کی حرمت بھی پامال ہو رہی ہے۔ ہندو پاکستان میں غالی معتقدین، جس میں شاید بعض کو اس کے معنی بھی معلوم نہ ہوں گے، اپنے ممدوحین کے لئے، اس کا بار بار اور کثرت سے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۳) نفحة العنبر في حياة امام العصر الشيخ انور تالیف: مولانا محمد یوسف بنوری ص:۱۸۳ (کراچی: ۱۳۸۹ھ)

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

''حضرت سے زیادہ، ائمہ اربعہ کے مذہب کا ماہر، میں نے نہیں دیکھا'' (۱)

حضرت علامہ کے ایک ممتاز شاگرد، مولانا محمد یوسف بنوری نے، حضرت گنگوہی کے فقہی مرتبہ اور کمال نظر کے متعلق حضرت علامہ کے اشعار کی، گویا وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حضرت گنگوہی کو اللہ تعالیٰ نے فقاہت نفس سے سرفراز فرمایا تھا، مسلک حنفی کو ادلۂ حدیث سے ثابت کرنا اور جو حدیث بظاہر مخالف نظر آئے، اس کا جواب دینا، حضرت گنگوہی نے اس فریضہ کو کامیابی سے ادا کیا اس کے علاوہ فقہاء حنفیہ متاخرین کی، جو تفریعات حدیث کے خلاف تھیں، ان کی فقہ حنفی سے برأت کی، علاوہ ازیں فقہ میں توسع اور تضییق کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی'' (۲)

حضرت مولانا کا یہ فضل وکمال، مجتہدانہ رویہ اور فقہ میں نرالی شان، حضرت مولانا کے فتاویٰ سے چھلکی پڑ رہی ہے، ہر اک اہم فتویٰ حضرت مولانا کی وسعت نظر، جامعیت اور گہری بصیرت اور منفرد کیفیت کا ترجمان ہے، جس کا حضرت مولانا کے فقہ وفتاویٰ پر رسائل ومؤلفات، معروف ومطبوعہ فتاویٰ رشیدیہ سے علم اور اندازہ ہوتا ہے۔ زیر نظر تازہ مجموعہ فتاویٰ، باقیات فتاویٰ رشیدیہ سے بطور خاص حضرت کے فقہی مقام ومرتبہ کا ترجمان و گواہ ہوگا، اور اس کے ذریعہ سے، حضرت مولانا کے اس مجتہدانہ فقہی مقام اور فقاہت نفس کا اور زیادہ گہرا زیادہ وسیع مشاہدہ وتجربہ ہوگا، جس کی جانب حضرت علامہ انور شاہ صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔

ذوق سلوک ومعرفت حضرت مولانا کا جس بستی اور جس خانوادہ سے وطنی اور نسبی تعلق تھا، اس میں علم کے ساتھ روحانیت اور تعلق مع اللہ کی چاشنی ہمیشہ شامل رہی۔ بڑے اہل اللہ مشائخ اور ارباب طریقت سے وابستگی اور ان کے دامن تربیت میں سفر سلوک، ایک قدیم معمول تھا۔ حضرت مولانا کے والد بھی اپنے وقت کے ایک بلند پایہ شیخ، مولانا شاہ غلام علی نقشبندی سے بیعت تھے، یہ اثرات اور نسبت حضرت مولانا میں بھی منتقل ہوئے۔ حضرت مولانا کا دینداری اور خداترسی کا طبعی مزاج تھا، جس پر تصوف ومعرفت کی بعض تصانیف، خصوصاً مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی کی مشہور تالیف: گلزار ابراہیم بہت اثر انداز ہوئی۔ حضرت مولانا کو نوعمری سے مثنوی گلزار ابراہیم سے مناسبت تھی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی اطلاع ہے کہ:

---

(۱) الانور [مجموعہ براحوال حضرت علامہ انور شاہ کشمیری] مرتبہ عبدالرحمن کوندو، ص: ۱۸۳ [ندوۃ المصنفین دہلی: بلا سنہ]

(۲) بنوری نمبر، ص: ۱۰۴ [ماہنامہ بینات کراچی: ۱۳۹۸ھ۔ ۱۹۷۸ء]

خوش الحانی کی وجہ سے آپ کے رفقاء واحباب کی آپ سے فرمائشیں ہوا کرتی تھیں کچھ پڑھ کر سنادو، مگر آپ اکثر گریز فرماتے تھے، ہاں! جب اصرار زیادہ ہوتا، تو کوئی نظم خصوصاً [قصہٗ] ابراہیم بن ادہم، خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔(۱)

شاہ سلیمان تونسوی یا شاہ عبدالغنی مجددی سے بیعت کا خیال

حضرت مولانا نے گنگوہ میں بھی ارباب مشائخ وطریقت کو خوب دیکھا، برتا تھا، اور دہلی تو رشک بغداد بنا ہوا تھا، یہاں بڑے بڑے ارباب سلوک تشریف فرما تھے، اور تعلق مع اللہ کی دولت عام فرما رہے تھے، حضرت مولانا کے ایک بڑے استاذ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی بھی سلسلہ نقشبندیہ کے مرشد اور رہنمائے کامل تھے۔ حضرت مولانا مملوک العلی کے بھی، دہلی کے مشائخ طریقت سے قریبی مراسم تھے، اور ان کے وطن اور نواح کے اہل ارشاد وتربیت بھی، مولانا مملوک العلی سے رابطہ وملاقات رکھتے تھے، جس میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی بطور خاص شامل تھے، حضرت حاجی صاحب سے، حضرت مولانا کی بھی ملاقات وارادت تھی مگر دل کے معاملات نرالے ہوتے ہیں، حضرت مولانا گنگوہی کا زمانہ طالب علمی سے، حضرت شاہ عبدالغنی یا ہندوستان کے ایک مشہور وممتاز مرشد، مولانا شاہ سلیمان تونسوی سے بیعت ہونے کا خیال تھا، لیکن طبعی تقاضہ کے باوجود، شاہ سلیمان کی خدمت میں حاضری کا موقع نہیں ملا تھا، کہ تعلیم مکمل ہوجانے کی وجہ سے، دہلی سے وطن واپسی ہوگئی اور ہرچند کہ حضرت حاجی امداداللہ سے گہری واقفیت تھی مگر حاجی صاحب سے بیعت ہونے کا خیال تک نہیں تھا، بیعت کے لئے شاہ سلیمان صاحب تونسوی، اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کی جانب نگاہ جاتی تھی، لیکن جس کے نصیب میں جہاں سے دولت ونعمت مقدر ہوتی ہے، وہیں سے پہنچ جاتی ہے۔

تھانہ بھون کا ایک غیر متوقع سفر اور حضرت حاجی صاحب سے اچانک بیعت

حضرت مولانا، کسی عزیز کے نکاح کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے، گنگوہ سے رامپور آئے تھے، ان دنوں حضرت مولانا کی، حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی سے کسی علمی مسئلہ پر مراسلت ہو رہی تھی، حضرت مولانا کی رائے یہ ہوئی کہ تحریر ومکاتبت سے، اس مسئلہ کا طے ہوجانا، مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لئے تھانہ بھون کا سفر کرکے، حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی سے زبانی گفتگو کرلی جائے، اس میں بحث کے تمام پہلو واضح اور منقح ہوجائیں گے اور فریقین کسی بہتر رائے اور قول فیصل تک پہنچ سکیں گے۔ اس خیال کی وجہ سے رام پور منیہاران سے تھانہ بھون آئے، یہاں اول حضرت حاجی امداداللہ کی خدمت میں پہنچے، حضرت حاجی صاحب سے رامپور کے رشتہ سے کچھ قرابت بھی تھی اور حضرت مولانا مملوک العلی کے ذریعہ سے تعارف اور عقیدت بھی، حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کیسے آنا ہوا، اور جب حضرت مولانا شیخ محمد سے گفتگو کے ارادہ کا علم ہوا، تو اس سے منع فرمادیا، حضرت

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۲۶، حصہ اول۔ طبع اول اور اس کے عکس [Re print]

مولانا گنگوہی نے وہ ارادہ ملتوی کردیا۔ اسی دوران حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہونے کا تقاضہ ہوا، اس سے پہلے حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو چکے تھے (۱) حضرت حاجی صاحب نے اول اول انکار کیا، پھر بیعت کرلیا، حضرت مولانا، اگرچہ اس خیال سے نہیں آئے تھے مگر حضرت حاجی صاحب کی ہدایت پر قیام کا ارادہ کرلیا، چالیس دن تک، حضرت حاجی امداداللہ کی صحبت و تعلیمات سے بہرہ ور اور مالا مال رہے، چالیسویں دن حضرت حاجی صاحب نے اجازت وخلافت سے نواز کر، وطن واپس فرمادیا۔

مولانا شیخ محمد صاحب سے اختلاف اور مناظرہ کی روایت پر ایک نظر حضرت حاجی امداداللہ سے بیعت کے تذکرہ میں، حضرت مولانا گنگوہی مولانا شیخ محمد تھانوی سے اختلاف اور ملاقات وگفتگو کا عموماً تذکرہ آتا ہے، یہ بات مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے جذباتی انداز میں کچھ اس طرح لکھی ہے، جس سے مولانا شیخ محمد کی تنقیص ہوتی ہے اور حضرت مولانا گنگوہی سے بھی بدگمانی ہوسکتی ہے، اس واقعہ کی صحیح حقیقت حضرت مولانا تھانوی کی ایک روایت اور مولانا شیخ محمد تھانوی کی کتاب پر حضرت مولانا کی تقریظ سے صاف معلوم ہورہی ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے فرمایا:

"مولانا گنگوہی جب اول بار حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون آئے تھے، اس وقت مولانا شیخ محمد صاحب سے ایک مسئلہ میں اختلاف تھا، خط وکتابت کیا کرتے تھے، خیال ہوا کہ خط وکتابت سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا، زبانی گفتگو کریں گے۔ (۲)

مگر جس طرح مولانا عاشق الٰہی نے اس کا ذکر کیا ہے، وہ قابل قبول معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ مولانا شیخ محمد صاحب حضرت شاہ محمد اسحاق کے ابتدائی عہد درس کے مشہور شاگرد، نامور عالم اور محدث تھے، حضرت مولانا مملوک العلی اور حضرت مولانا گنگوہی کے استاذوں کے ہم عصر اور علمی دنیا میں بھی خاصے معروف تھے، حضرت مولانا گنگوہی نے ان تمام حیثیتوں اور اس تفاوت علم وعمر کا خیال نہ رکھا ہوا اور حضرت مولانا سے مناظرہ کرنے کے لئے آ گئے ہوں، حال آں کہ حضرت مولانا، مولانا شیخ محمد صاحب کو استاذی وطجائی سے یاد کیا کرتے تھے۔ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی ایک تالیف: "**دلائل الاذکار فی اثبات الجہر والاسرار**" پر حضرت مولانا گنگوہی کی ایک تائید وتقریظ ہے، اس میں مولانا شیخ محمد کا بلند الفاظ وکلمات سے نام لیا ہے۔ لکھا ہے:

"مجمع علوم نقلی وعقلی، منبع برکات علوی وسفلی، استاذی وطجائی وملاذی، ملک العلماء، رئیس الفضلاء، تاج الاتقیاء شیخ مشائخ العرفاء، جناب مولانا شیخ محمد تھانوی"

(۱) تذکرۃ الرشید ص [عکس طبع اول، سہارنپور، ۱۹۷۷ء] جمیل الکلام محمود ملفوظات حضرت مولانا تھانوی مرتبہ مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی [مشمولہ الفصل للوصل] ص ۷۰، طبع اول مقبول المطابع بارہ بنکی۔

(۲) جمیل الکلام محمود ملفوظات [حضرت مولانا تھانوی] مرتبہ مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی ص ۷۰ [مشمولہ الفصل للوصل طبع اول، ہردوئی]

اس مختصر تحریر کے آخر میں، حضرت مولانا نے، مولانا شیخ محمد کے لئے ایک مرتبہ اور، استاذی کا لاحقہ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"نزد فقیر حق ہمیں است کہ حضرت اوستاذ، مصنف رسالہ ہذا تحریر فرمودہ۔ دام ظلہ العالی" (۱)

جس شخص کو حضرت مولانا گنگوہی ایسا عالی مرتبہ تسلیم فرمارہے ہوں، استاذی و ملجائی سے یاد کرتے ہوں، ایک تحریر میں، دو، دوجگہ استاذی لکھ رہے ہوں، انہی سے مناظرہ کرنے آئے ہوں اوران پر گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں، کا فقرہ یا پھپتی کسی ہو، طبیعت قبول نہیں کرتی۔

حضرت مولانا سے پہلی بیعت اور افادہ کا سلسلۂ دراز حضرت حاجی صاحب سے اجازت وخلافت کے بعد، حضرت مولانا جب وطن پہنچے، اسی وقت سے بغیر اطلاع اور خبر کے، حضرت مولانا کی جانب راہ خدا کے مسافروں کا رجوع شروع ہوگیا تھا۔ سب سے پہلے ایک خاتون، اپنے ذوق وشوق سے، حضرت حاجی امداداللہ کی فرمائش پر، حاجی صاحب کی موجودگی میں بیعت ہوئیں، اس کے بعد اس سلسلہ میں ہر دن اضافہ ہوتا رہا، ہزاروں افراد نے حضرت مولانا سے اسباق سلوک حاصل کئے، اور ایک بڑی تعداد [تقریباً ستر پچہتر یا زیادہ اصحاب کو، اجازت وخلافت سے نوازا گیا، جس میں سے چند کے علاوہ، تقریباً سب نے ہی اس عہد کو وفا کیا، جوانہوں نے حضرت مولانا سے کیا تھا اور اسی طریقہ پر قائم واستوار رہے، جس کی حضرت مولانا نے رہبری فرمائی تھی، اسی راستہ پر چلے، آگے بڑھے بڑھتے چلے گئے۔

برسبیل تذکرہ مگر افسوس کہ آج وہ طریقہ جو تصوف کی اصل روح، اصل جان اور درحقیقت جو ہر شریعت وسنت ہے، گویا ہمارے یہاں سے فراموش ہوگیا ہے اور ہر شخص نے جس کو سلوک ومعرفت کی خبر ہونہ ہو، اس راہ سے گزراہو نہ گزراہو، دین وشریعت اور سلوک وتصوف کے باہمی گہرے اور لاینفک رشتہ سے واقف ہو، یا نہ ہو، پیری مریدی کا کام [بلکہ مجھے معاف فرمایا جائے، دھندہ] اور کاروبار شروع کردیا ہے، ہر شخص بزعم خود مرشد بنا ہوا ہے اور کسی نہ کسی کے حوالہ سے، کسی نہ کسی تدبیر سے، دوسروں کو اپنے دام فریب میں پھنسالینا اور اس کے ذریعہ اپنی دنیاوی ضرورت پوری کرنا اور حطام دنیا حاصل کرنا، اپنا مقصد بنالیا ہے۔ ایسے میں سخت ضرورت ہے کہ اس طریقہ کی ایک مرتبہ پھر، پوری قوت سے، پوری شدت سے، پورے زور سے آواز لگائی جائے اور کہا جائے کہ تصوف کا صرف وہی راستہ قابل قبول اور دین وشریعت کا راستہ ہے، جس کی کڑیاں ماانا علیہ واصحابی سے جڑی ہوں، جس کے سلف صالحین داعی ومبلغ رہے اور جس میں خارجی اثرات اور غیر اسلامی تصورات اور بدعات ورسومات کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں، اگر اس کے علاوہ کچھ ہے

(۱) دلائل الاذکار فی اثبات الجھر والاسرار، ص: ۹۸ [فخر المطابع دھلی: (۱۲۷۰ھ- ۱۸۵۴ء)

اور کوئی شخص، اس طریقہ کی صحیح کامل واقفیت، تربیت اور مسافرت کے بغیر، اس سفر کو طے کر رہا ہے، اس کام میں لگ گیا ہے اور اس کے ذریعہ دوسروں کو پھنسا لینے اور اپنا ہم نوا اور مرید بنا لینے کی کوشش کر رہا ہے، تو اس کا راستہ نہ شریعت کا ہے، نہ دین کا، نہ تصوف کا اور اس سے صاف کہدینا چاہئے کہ:

کیں راہ کہ میروی بترکستان است

بہر حال حضرت مولانا گنگوہی نے، سلوک کی تعلیمات اور تربیت میں، سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی مطابقت کو پسند کیا۔ اپنے لئے بھی اتباع سنت کی راہ اختیار فرمائی اور اپنے زیر تربیت مریدین و متوسلین کو بھی، اسی راستہ سے حق آشنا کیا، اگرچہ حضرت مولانا کو چشتی تعلیمات میں گہری بصیرت، بلکہ کہنا چاہئے مقام امامت و اجتہاد حاصل تھا اور حضرت مولانا اس میں، حضرت حاجی امداد اللہ کے علاوہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی سے بھی ایک ذاتی نسبت، ان کی فکر میں گہری بصیرت، وسیع فنی علمی تاریخی نگاہ رکھتے تھے مگر حضرت مولانا ان منابع سے اخذ واستفادہ اور ان سے اثر پذیری کے باوجود، اپنے متوسلین کے لئے وہ راہ اختیار کی، جس میں صبغۃ اللہ کی گہری آمیزش اور اتباع سنت کی، اعلیٰ درجہ کی تراوش ہے۔

رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

حضرت مولانا کا ایک اہم خواب اور حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ سے اس کی تعبیر یہ حضرت مولانا کا طبعی مزاج اور وہ خلقی تاثر تھا، جس کا ایک خواب میں بھی اول دور میں ہی، مشاہدہ کرادیا گیا تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی نے، اپنے پہلے سفر حج کے دوران، مکہ مکرمہ میں خواب دیکھا تھا، کہ:

"[حضرت مولانا کی] چار انگلیوں سے خون جاری ہے، دو سے بکثرت تیسری سے کم، چوتھی سے کچھ اور کم"

حضرت مولانا نے یہ خواب حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے عرض کیا [جو اس وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھے] اور اس کی تعبیر چاہی، حضرت مولانا مظفر حسین نے فرمایا:

"تمہاری چاروں نسبتیں جاری ہوں گی، دو کا جریان بہت زیادہ ہوگا"

حضرت مولانا اس خواب کو نقل کرنے کے بعد، [آخر عمر میں] فرمایا کرتے تھے:

"اس وقت سے اب تک منتظر ہوں، مولوی مظفر حسین صاحب زندہ ہوتے تو کہتا، کہ آپ ہی نے تعبیر فرمائی تھی، لیجئے اب کچھ کہئے" (۱)

حضرت مولانا گنگوہی کا سلوک و معرفت کا فیضان، اہل طلب اور اہل ذوق کی روحانی تربیت اور ان کو منزل تک پہنچانے کی تمام تر کاوشیں اور پوری تاریخ، اسی خواب کی تعبیر ہے۔

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۲۰۶، جلد اول، نیز اختر بہشت چاند پوری ص ۷۲

سلوک و تربیت میں طریقہ نقشبندیہ مجددیہ، خصوصاً حضرت سید آدم بنوری کی تعلیمات کو، پسند کرتے تھے

حضرت مولانا نے اپنے متوسلین کی تعلیم اور تربیت باطن میں، سلسلۂ نقشبندیہ، خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی کے طریقہ تربیت اور راہ شریعت وسنت کو، سب سے بڑا رہنما اور اصل قرار دیا اور آخر تک تقریباً تمام ہی متوسلین کو اسی راستہ سے لیکر چلے اور راہ حقیقت سے آشنا کرایا۔

حضرت مولانا کی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے انسیت اور اس کو اپنے عمل میں زندہ رکھنے کا، کئی موقعوں پر تذکرہ ہوا ہے، مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی کی اس تحریر میں بھی، جو حضرت کے طریقہ تعلیم سلوک، پر تذکرۃ الرشید میں شامل ہے، اس کا اشارہ کیا گیا ہے (۱) اور حضرت کے ایک گم نام خلیفہ، متوسل اور سوانح نگار، مولوی اللہ بخش قابل بجنوری (۲) کی معلومات اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ:

"اگرچہ مولانا کو حاجی صاحب کی وجہ سے چاروں سلسلوں سے اجازت تھی مگر نسبت و توجہ باطنی غالباً زیادہ نقشبندی ہی تھی" (۳)

حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی، حضرت کے اس ذوق اور معمول کا صاف تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کو، حضرت سید آدم بنوری سے، بہت زیادہ مناسبت تھی اور سلوک میں انہی کے طریقہ کو زیادہ پسند فرماتے تھے، اگرچہ مبتدی کے لئے چشتیہ کے اذکار و اعمال کو، زیادہ تر مفید فرماتے تھے مگر انتہا میں حضرت سید صاحب ہی کا طریقہ ان کا پسندیدہ تھا" (۴)

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص: ۴۵، جلد دوم

(۲) مولوی مظہر الحق اللہ بخش قابل چاند پوری کا آئندہ صفحات میں بھی حوالہ آئے گا، اس لئے یہاں ان کا کچھ تعارف ضروری ہے۔ مولوی مظہر الحق اللہ بخش چاند پور ضلع بجنور کے ایک علمی گھرانہ کے فرد تھے، ان کے نانا، مولوی قادر بخش چاند پوری حضرت شاہ غلام علی کے مجاز بیعت تھے، (اص ۸۳) اس گھرانہ میں اور بھی اہل علم اور اصحاب سلوک تھے مولوی مظہر الحق کا خاصا وقت درس و تعلیم میں گزرا، محرم ۱۳۱۲ھ میں حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت ہوئے، حضرت کی خدمت میں کثرت سے حاضر ہوتے رہے اور مہینوں قیام کرتے تھے، بالآخر حضرت نے اجازت وخلافت سے نوازا، حضرت کی وفات کے بعد، چاند پور سے ترک وطن کر کے میرٹھ آگئے تھے، یہیں رہے یہیں وفات پائی۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے، کئی مطبوعہ تالیفات ہیں، جس میں سے اختر بہشت (عقائد فقہی مسائل اور اختلافی مباحث پر ہے) اس کے کل چار حصے ہیں جس میں سے تین و چار میرے پاس ہیں، چوتھا حصہ حضرت مولانا گنگوہی (ص ۳۳ تا ص ۹۶، کے احوال و تذکرہ پر مشتمل ہے) (مطبوعہ میرٹھ ۱۳۲۸ھ۔ ۱۹۰۸ء)۔

بڑی بات یہ ہے کہ مولوی مظہر الحق صاحب، جیسا کہ ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت مولانا سے، حضرت کے ذاتی احوال دریافت کرتے رہتے تھے، اور ان کی یادداشت محفوظ رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی بعض اطلاعات خصوصاً ۱۸۵۷ء سے اختلاف کیا ہے، مولوی مظہر الحق کی کئی نجی تحریریں اور خطوط میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں ایک بہت اہم اطلاع یہ تھی کہ مولوی صاحب نے اپنی مسموعات و معلومات کی روشنی میں، حضرت مولانا گنگوہی کی مفصل سوانح، چار جلدوں میں لکھی تھی جس کا مسودہ چوری ہو گیا تھا۔ پھر اس کا پتہ نہیں چلا، کاش یہ ملتی تو شاید حضرت کی معتبر سوانح کی ضرورت پوری ہو جاتی۔

(۳) اختر بہشت ص: ۸۵

(۴) مکتوب شعبان ۱۳۵۹ھ۔ بنام مولانا محمد یوسف بنوری۔ مولانا بنوری نمبر ص ۸۹، ماہنامہ بینات (کراچی ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء)

حضرت مولانا کا مقام ومرتبہ پیرومرشد کی نگاہ میں حضرت حاجی صاحب کے رفقاء میں اوروں کا کیا تذکرہ، خود حضرت حاجی صاحب، حضرت مولانا کو اپنے تمام خلفاء پر ترجیح دیتے تھے، بلکہ یہاں تک فرماتے تھے کہ:

"اور یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ [میں] مولوی رشید احمد کو اپنے پیر کی جگہ جانتا ہوں" (۱)

حضرت حاجی صاحب کی حیات میں ہی، حضرت مولانا کے بڑے اور ممتاز خلفاء، حضرت مولانا کو، حضرت حاجی صاحب کا قائم مقام اور اپنا پیرومرشد سمجھتے تھے اور حضرت کے ساتھ وہی معاملہ کرتے تھے، جو ان کا حضرت حاجی صاحب کے ساتھ تھا۔ مثلاً حضرت حاجی صاحب کے ممتاز اور محبوب خلفاء میں سے، مولانا محمد یعقوب، حضرت مولانا گنگوہی کو، بجائے مرشد سمجھتے تھے" (۲) حضرت حاجی صاحب کے اور بھی متعدد خلفاء کی تحریروں اور خطوط میں، اس طرح کی تصریحات اور اعتراف موجود ہے۔

حضرت حاجی صاحب اپنے خلفاء اور متعلقین میں حضرت مولانا پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے، حضرت مولانا سے کوئی خدمت بھی نہیں لیتے تھے، کبھی پیر بھی نہیں دبواتے تھے، حال آں کہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے کبھی کبھی پیر دبوالیتے تھے مگر حضرت مولانا گنگوہی سے یہ خدمت گوارہ نہیں تھی، نیز حضرت حاجی صاحب کی اہلیہ محترمہ بہت اصرار کے بعد، حضرت حاجی صاحب کی فرمائش پر، حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت ہوئی تھیں۔ (۳)

حضرت گنگوہی خود اپنی نگاہ میں ان تمام کمالات اور اس رفعت شان کے باوجود، جس کا اور ہزاروں دیکھنے جاننے والوں کے علاوہ، بہت سے غیر متعلق مشائخ اور بلند مرتبہ اہل علم وکمال بھی برملا اعتراف واظہار کرتے تھے اور حضرت مولانا کی روحانی بلند پروازی اور علمی مقام، دونوں کی جانب اپنے متعلقین ومتوسلین کو متوجہ فرماتے رہتے تھے، مگر حضرت مولانا خود کو، ذرۂ بے مقدار اور ہیچ محض خیال فرماتے تھے۔ حضرت مولانا کے مکتوبات میں ایسے بیسوں اندراجات ہیں کہ انہیں پڑھنے والا حیرت میں ڈوب جاتا ہے، یا اللہ! کیسے لوگ تھے، کیسے بڑے عالم، خادم قرآن وسنت، برگزیدۂ روزگار، نادر العہد والزمان اور اپنے دور کے علاوہ، آنے والی نسلوں کے علماء کے مقتداء اور تواضع ومسکنت، اللہ اللہ! ایسی بے نفسی، ایسا عرفان ذات، ایسی خود شکنی اور اس درجہ کی بے چارگی اور بے حیثیتی کا اظہار اور بار بار:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

کا اعلان۔ مجھے یہاں مولانا عبدالحی حسنی کا وہ دلی تاثر بے ساختہ یاد آرہا ہے، جو علمائے دیوبند سے ملاقات کے بعد ہوا تھا، جس کا مولانا حسنی نے اپنے سفرنامے میں اس طرح اظہار کیا ہے:

---

(۱) مکتوب بنام مولانا رفیع الدین دیوبندی۔ مکتوبہ اواخر ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ۔ مکتوبات اکابر دیوبند مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی ص: ۳۸ [دیوبند: ۱۹۸۰ء]

(۲) جمیل الکلام [مجموعہ ملفوظات حضرت مولانا تھانوی] مرتبہ مفتی جمیل احمد تھانوی۔ ص: ۳۸ [طبع اول، مقبول المطابع، بارہ بنکی۔ بلاسنہ]

(۳) جمیل الکلام ص: ۷۷

"ان میں وہ مسکنت اور غربت، ہم میں یہ خودداری اور نخوت، ان میں وہ سادگی اور بے تکلفی، ہم میں یہ تکلف اور یہ مستی۔ این الثری من الثریا" (۱)

حضرت مولانا کا، حضرت حاجی امداد اللہ سے اپنی خاص کیفیات کا تذکرہ حضرت مولانا کو منجانب اللہ جو کمالات عطا ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت مولانا کو، اپنی حیثیت کے ادراک اور خالق جل شانہ کی علوئے مرتبت کے، جس اعلیٰ ترین احساس و کیفیت تک پہنچادیا تھا، اس کا خود حضرت مولانا کے، حضرت حاجی امداد اللہ کے نام ایک اہم مکتوب میں، بے ساختہ اظہار ہوا ہے، جس کا حرف حرف پڑھنے کا ہے۔ اسی میں فرماتے ہیں:

"حضرت کے اقدام نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خلاصہ ہے کہ جذر قلب [منتہائے قلب] میں، غیر حق تعالیٰ سے نفع وضرر کا التفات نہیں۔ واللہ! بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی ہو جاتی ہے۔ البذا کسی کی مدح وذم کی پرواہ نہیں رہی، اور ذام ومادح کو دور جانتا ہوں اور معصیت کی طبعاً نفرت اور اطاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہو گئی ہے" (۲)

حضرت حاجی صاحب کا تاثر وارشاد حضرت کو یہ مکتوب ملا، اس کے مضمون پر بے حد خوشی کا اظہار کیا اور خصوصاً اس میں جو یہ ایک فقرہ تھا کہ: "بندہ کو مدح وذم برابر ہے" اس پر فرمایا:

یہ بہت بڑا مقام ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، عزیز من! کہنے کو تو یہ دو لفظ ہیں کہ مدح وذم برابر ہے، مگر بہ خدا! اس کی تحصیل میں بہت عمریں ختم ہو گئیں اور بجز معدودے چندے، بہت کم لوگ کامیاب ہوئے" (۳)

متوسلین اور مسافران راہ سلوک کے لئے چند اصول اور ضوابط حضرت مولانا نے، اگرچہ اجازت وخلافت کے چند روز بعد ہی، مسند ارشاد سنبھال لی تھی اور وفات سے چند روز پہلے تک اہل دل، اہل ذوق اور اہل طلب کو بیعت فرماتے رہے اور جو حضرات وابستۂ دامن ہو کر، سفر سلوک طے کرنا اور اپنے امراض باطنی کا علاج اور معرفت الٰہی کا راستہ جاننا چاہتے تھے ان کی مکمل رہنمائی وسرپرستی فرماتے، اوراد واشغال، مجاہدات ومراقبات اور جس کے لئے جو طریقۂ ذکر وتعلیم مناسب ہو اور جس کو جس راستے سے لیجانا چلانا مناسب ہو، اس کی تدبیر فرماتے مگر ہر اک کے لئے عقیدہ کی کامل اصلاح، تمام بدعات سے اعلیٰ درجہ کی توبہ اور رسوم وفضولیات کا ترک ضروری تھا۔ عموماً طالبان علوم اور ایسے اصحاب کو، جو قرآن مجید کی تعلیم یا حدیث نبوی اور علوم

(۱) دلی اور اس کے اطراف ص: ۱۰۷، دلی ۱۹۵۸ء (۲) مکتوب محرم ۱۳۰۶ھ، مشمولہ مکاتیب رشیدیہ، ص: ۱۰، طبع اول میرٹھ۔

(۳) ترجمہ اردو، انساب المحمودیہ فی آثار العودیہ، تالیف علامہ شعرانی، ترجمہ وحاشیہ از مولانا ظفر احمد تھانوی، حاشیہ ص: ۲۳۰، مطبوعہ ماہنامہ النور تھانہ بھون، ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ، شمارہ ۸، ج: ۹۔

اسلامیہ کی تعلیم وتدریس میں مشغول ہوں، اذکار وغیرہ کا بہت پابند نہ بناتے تھے فرماتے کہ قرآن مجید کی تعلیم اوراد ومعمولات میں مشغول ہونے سے بہتر ہے اور درس حدیث کا نفع یقینی اور نقد ہے، معمولات سلوک کا نفع اس درجہ یقینی نہیں۔

بہر حال حضرت مولانا اس کا بہت خیال فرماتے تھے، کہ طالبین کی طبیعتوں میں، اصل عظمت قرآن کریم، حدیث شریف، علوم شرعیہ اسلامی کی راسخ ہو، تصوف اور سلوک کے کمال کا جو بھی مقام ہو مگر اوراد واشغال کو، ان کے درجہ میں رکھا جائے، بنیادی دینی امور کو ان کے درجہ میں۔ اس کی بھی کوشش فرماتے تھے، کہ اہل سلوک اپنی عرفانی کیفیات اور معمولات کے اہتمام کا پورا خیال رکھیں مگر ساتھ میں کوئی دینی خدمت اور ممکن ہو تو علمی مشغلہ بھی ضرور رہے، نیز اگر کسی متوسل کی عقیدہ کے معمولی بے راہ روی، کسی بدعت میں شمولیت یا رسوم کی پابندی کی خبر ملتی، اس کی تصدیق کے بعد متعلقہ افراد کو سخت تنبیہ کرتے، ان سے پکھایا معاملہ فرماتے کہ وہ اپنی اس غلطی سے علانیہ توبہ کریں، اپنی برأت ظاہر کریں یا حضرت مولانا کے تعلق اور سلسلہ بیعت وارادت کو خیر باد کہہ دیں۔ عقیدہ کی خرابی کا علم ہونے کے باوجود، اس سے توبہ نہ کرنا اور کسی بدعت کا معمول یا اس سے وابستگی، حضرت مولانا کے یہاں ذرا دیر کے لئے بھی قابل قبول نہیں تھی، اس میں کسی مفاہمت کا سوال ہی نہیں تھا، اگر ان برائیوں پر ذرا بھی اصرار یا ان کا اہتمام دیکھ لیتے تو روابط منقطع فرمادیتے۔

اسی طرح اجازت بیعت کے لئے بھی، سالک کا اعلیٰ درجہ کا متبع شریعت وسنت ہونا ضروری تھا، کسی دینی عمل میں ادنیٰ درجہ کی کوتاہی، خصوصاً فرائض اسلام اور معاملات کی غفلت کو اجازت وخلافت کے منافی خیال فرماتے تھے مگر ان کڑی شرائط سخت محاسبہ اور انتہائی نگرانی کے باوجود، بے شمار افراد، تربیت باطن، سیر سلوک اور ارشاد وتربیت کے لئے، حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کو سعادت سمجھتے، حضرت کی ہر اک تنبیہ کو اپنی اصلاح اور ترقی باطن کے لئے، نیک فال اور سعادت کبریٰ جانتے تھے۔ ان کے لئے حضرت مولانا کی خدمت وصحبت میں گزرا ہوا ہر اک نیا دن، نئی روحانی ترقی کا زینہ اور معرفت الٰہی کی چاشنی حاصل کرنے میں مفید ومددگار ثابت ہوتا تھا، بالآخر یہ رنگ ایسا پختہ اور ان مٹ ہو جاتا تھا، کہ اس کے علاوہ کوئی رنگ، کوئی انداز اور طریقہ نہ پسند آتا تھا، نہ قابل قبول رہتا تھا۔ بہر حال حضرت نے ایسے حضرات کو خلافت واجازت سے نوازا جن پر توحید کا اثر قوی اور رد بدعات کا ذوق عالی ہوتا تھا، اور اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ اصحاب اپنی زندگی اسی راہ پر گزاریں گے اور اس راستہ اور دین صحیح کے خلاف جو کچھ بات ہوگی، اس کی پوری قوت وطاقت سے مزاحمت کریں گے، اور اپنے صحیح اسلامی رنگ پر، کسی رنگ، کسی آہنگ، کسی آواز کو غالب نہیں ہونے دیں گے۔

تحریک ۱۸۵۷ء میں شرکت اور اس کی عملی جدوجہد اہل فکر ونظر اور بڑے علمائے کرام کا ہمیشہ یہ معلوم اور شیوہ رہا ہے، کہ وہ جس قدر بھی بڑی اور عالی مرتبہ خدمات انجام دیتے ہوں لیکن جب کوئی بڑی ملی ضرورت، میدانی کام کا

کوئی اہم تقاضہ سامنے آتا ہے تو سر بکف ہوکر میدان میں اُتر آتے ہیں اور اس وقت خود کو ملت کی فوج کا ایک سپاہی اور اس کو زوال کی راہوں سے نکالنے والے، کمانڈر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ اسی طرح کا معاملہ اور ایک بہت بڑی ملی اجتماعی ضرورت اور مطالبہ حضرت مولانا گنگوہی کے سامنے بھی آیا، تو حضرت مولانا نے بھی وہی فیصلہ فرمایا، جو ان کے پیشرو اور السابقون الاولون فرما چکے تھے۔ حضرت مولانا بکلفت میدان عمل میں اترے، اسلامی فوجی قوت کا ایک حصہ بنے اور مجاہدانہ انداز اور شجاعانہ حوصلوں کے ساتھ، داد مردانگی دکھائی اور میدان کارزار میں قدم جما کر، دشمنان اسلام سے لوہا لیا اور جہاد کا ایک زمانہ سے بھولا ہوا سبق، اپنے اہل وطن اور ملت اسلامیہ کو یاد دلا دیا۔ یہ ۱۸۵۷ء کی انگریز کے خلاف معرکہ آرائی کا موقع تھا، جس میں پورے ملک کے مسلمانوں اور اہل وطن کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ، یہ جماعت بھی پوری طرح سے شریک اور قدم بہ قدم تھی۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کے حوالہ سے یہاں گفتگو کی زیادہ گنجائش نہیں، مختصر یہ ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے بچپن اور طالب علمی میں، مغل حکومت کا دم واپسیں صاف محسوس ہو رہا تھا، مغل حکومت کا آفتاب اب گہنا گیا تھا، زرد پڑ چکا تھا، اور ڈوبا ہی چاہتا تھا۔ جس کے حکمرانوں کی عظمت کا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا، ان کے ناکارہ، نااہل، نکمے وارث، لال قلعہ کی دیواروں میں محبوس اور بے حیثیت واقتدار تھے اور اس قیام وانتظام کا چراغ بھی بجھنے ہی والا تھا، ان کی نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ کی کیفیت ہر ایک پر عیاں تھی، ملک کے اور معاملات وانتظامات کا تو تذکرہ ہی کیا۔ خود دہلی پر بھی سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریز قابض ہو چکا تھا۔

اسی کی حکومت تھی اسی کا انتظام تھا، لال قلعہ کے مسند نشینوں کی نہ کوئی وقعت تھی، نہ حیثیت و مرتبہ اور یہ بات ایسی نہیں تھی، جس کی مقامی ہندوستانیوں اور اہل بصیرت وغیرت کو تکلیف نہ ہو، ان حالات کی وجہ سے ہر ایک دل میں انگریزوں کی اس شاطرانہ، جابرانہ، غیر منصفانہ حکمرانی کے خلاف ایک جذبہ موجزن تھا، ہر ایک کو اس حکومت اور اس کے نظام اور کارندوں سے اختلاف تھا، وہ انگریزی کی غلامی کرنے اور اس کو جہاں پناہ کہنے کے لئے تیار نہیں تھے، اسی میں ایک دن ایسا آیا کہ وہ لاوا جو برسوں سے پک رہا تھا اور ظلم وستم کی جس کیفیت سے مدت سے نبرد آزما تھے، بے تاب ہو کر، بے قابو ہو کر شعلہ جوالہ بن کر پھٹ پڑی اور پورے ملک میں انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد کی آواز گونج گئی، ادھر سے اُدھر تک معرکہ وقتال برپا ہو گیا۔

ایسے میں یہ حضرات وعلماء، جو حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان کی نسبت تلمذ سے بہرہ ور، تحریک سید احمد شہید کے خوشہ چیں، علمائے دہلی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ کے دامن گرفتہ تھے، ان کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس اہم دینی ملی ضرورت اور وقت کے تقاضہ سے صرف نظر فرمائیں، اس لئے یہ حضرات بھی اسی جذبہ اسی حوصلہ اور مردانگی کے ساتھ،

میدان حرب ومقابلہ میں اتر گئے، داد شجاعت دی اور اپنے سے پچاسوں گنا بڑے، مضبوط اور حرب وضرب کی طاقتوں اور ہر طرح کے وسائل اور ہتھیاروں سے مسلح حریف کا، اپنی بساط سے بڑھ کر مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی۔ یہ شاملی وتھانہ بھون کا معرکہ تھا، جس کی ایک مستقل تاریخ ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقائے کرام نے، جن میں قاضی عنایت علی تھانوی، حضرت حافظ محمد ضامن شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی جیسے منتخب روزگار اصحاب بھی شامل تھے، اپنے علاقہ [تھانہ بھون شاملی، کیرانہ اور اس کے اطراف] میں، اس تحریک کی زمام سنبھالی اور اس علاقہ کو، انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اس کی فوجوں سے لوہا لینے کے لئے تیار کیا۔ شاملی تھانہ بھون اور کیرانہ بطور خاص، میدان کارزار بنا، ایک طرف انگریز، ان کے فوجی دستے، طاقتور اسلحے، توپ خانہ اور بارود کے انبار تھے، دوسری جانب یہ حضرات تھے، انہوں نے بھی حالات کا رخ دیکھتے ہوئے ہتھیاروں اور مقابلہ کی تمام تدبیروں اور سامان سے تیاری کی تھی۔ چنانچہ شاملی اور تھانہ بھون میں سخت مقابلہ ہوا، زور کا رن پڑا، میدان علمائے کرام اور ان کے ہم نواؤں کے ہاتھ رہا۔ ان لوگوں نے تھانہ بھون سے شاملی تک اور ادھر ادھر کا بھی خاصا حصہ انگریزوں حکمرانوں کے انتظام اور فوجی دستوں سے پاک کرا کر، اپنے قبضہ وانتظام میں لے لیا تھا مگر دوبارہ انگریز دس گنا قوت، نیز اپنے منتخب تجربہ کار فوجی دستوں اور بڑے توپ خانے کے ساتھ، تازہ دم کمک لیکر دوبارہ حملہ آور ہوئے، اگرچہ اس وقت بھی داد شجاعت دی گئی، میدان عمل پوری قوت سے سرگرم رکھا گیا مگر قضا وقدر کا فیصلہ یہی تھا، کہ اس وقت میدان انگریز کے ہاتھ میں رہے اور مستقبل کے لئے، انگریز کے ظلم وجبر اور استعمار کی ایک نئی تاریخ لکھی جائے، بہر حال اس جیش مسلمانان اور قافلہ سالاران حریت میں، حضرت مولانا گنگوہی بھی نہایت اولوالعزمی، جرأت اور استقامت کے ساتھ شامل وشریک رہے۔ حضرت مولانا اس کے ممتاز کمانڈروں اور فوجی رہنماؤں میں سے تھے، اسی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک ناکام ہونے کے بعد گرفتار کئے گئے، مقدمہ چلا، چھ یا آٹھ مہینے جیل میں رہے، اس معرکہ ومقدمہ کی تفصیلات، جلد ہی ان شاء اللہ کتابی صورت میں پیش کی جائیں گی۔

افسوس ہے کہ معرکہ شاملی وتھانہ بھون کا، کسی نے علمی تاریخی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا، اس لئے اس کے متعلق منقول ومشہور کئی باتیں بالکل غلط اور بے حقیقت ہیں، نیز کئی اور باتیں جن سے اس بات کی اہمیت کا علم ہوتا ہے، قطعاً نا معلوم اور گم نام ہیں۔ یہ عنوان اگرچہ تفصیلات کا طالب ہے مگر زیر نظر صفحات میں اس کی گنجائش نہیں، لیکن اس کی حضرت مولانا گنگوہی سے خاص وابستگی کی وجہ سے، اس کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں۔

اس لئے چند مختصر اشارات حاضر ہیں، پہلی بات ان حضرات کے احوال پر مشتمل تقریباً تمام ہی کتابوں میں لکھا ہے، کہ تھانہ بھون میں ۱۸۵۷ء کی تحریک قاضی عنایت علی کے بھائی، قاضی عبد الرحیم تھانوی کو کلکٹر سہارنپور کی ہدایت پر، اچانک بلا کسی

جرم اور ثبوت کے پھانسی پر لٹکا دینے کیوجہ سے برپا ہوئی تھی، تھانہ بھون اور اس کے اطراف میں پہلے سے اس کا کچھ تذکرہ اور تیاری نہیں تھی، اگر یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو اہل تھانہ بھون معمول کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ مگر یہ اطلاع صحیح نہیں، اس وقت علاقہ میں متعین انگریز حکام اور فوج کے کمانڈروں کی یادداشتوں، تحریروں سے عیاں ہے، کہ یہ پہلے سے منصوبہ بند، نہایت منظم، وسیع اور ایسی تحریک تھی، جس نے اس پورے علاقہ میں، انگریزوں کو ناک چنے چبوادیئے تھے۔ تحریک کے قائدین نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے، سوچ سمجھ کر تیاری اور انتظامات کر لئے تھے، متحرک فوجی دستوں کے لئے رسد اور سامان کی فراہمی کا بھی معقول اور بڑا انتظام کیا گیا تھا، یہاں تک کہ دریائے جمنا اور گنگا میں، دو سو ایسی کشتیاں تیار رہتی تھیں جس میں مسلح افراد مقابلہ کے لئے تیار رہتے تھے اور میدان مقابلہ تبدیل کر لینے کی صورت میں، تیزی سے رفقائے لشکر کو یہاں سے وہاں تبدیل کر سکتے تھے۔

روزنامچوں اور بعد میں دریافت کاغذات سے یہ بھی سراغ ملا ہے، کہ قاضی عنایت علی کے دربار دہلی [بہادر شاہ ظفر] سے روابط و تعلقات تھے، مزید یہ کہ دہلی کے کوتوال [سید مبارک علی] قاضی صاحب کے مخلص اور ہم نوا تھے، قاضی صاحب [سید مبارک علی] سے خفیہ اطلاعات و معلومات کے لئے، رابطہ میں رہتے تھے۔

یعنی شاملی تھانہ بھون اور اس کے اطراف میں ۱۸۵۷ء کی طاقتور جدوجہد، کسی وقتی تاثر کا نتیجہ اور قاضی عبدالرحیم کی پھانسی کا ردعمل نہیں ہوسکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قاضی عنایت علی نے تمام تیاریاں کر رکھی تھیں، قاضی عبدالرحیم کی پھانسی، اس کو عمل میں لانے کا سبب بن گئی تھی۔

تذکرۃ الرشید میں شاملی اور تھانہ بھون کے واقعات کا، غیر واضح اور ذومعنی الفاظ میں تذکرہ کیا ہے، شاید اس لئے کہ جب تذکرۃ الرشید لکھی گئی [۱۹۰۸ء میں] اس وقت ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس میں حکومت کے خلاف کھڑے ہونے والوں کی، خدمات و کمالات کا تذکرہ اور ان کی تحسین، خود اپنے کو خطرے میں ڈالنے کا کام تھا، اس لئے مولانا عاشق الٰہی نے ایسے الفاظ استعمال کئے کہ: جن سے باغبان بھی خوش رہے، راضی رہے، صیاد بھی۔

مجموعی اصلاحی خدمات نیز دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے فکر و مزاج کی تشکیل

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کی ذات گرامی اپنے آپ میں ایک بڑا مرکز اصلاح و تربیت، بڑا ادارہ اور ایک بڑا دارالعلوم تھی۔ جس میں علم و تدریس کا سلسلہ بھی تھا اور تربیت باطن کی فکر بھی، قدم قدم اتباع سنت کا ذکر اور رسومات و بدعات کی بیخ کنی کا بھی اہتمام تھا نیز خانوادہ ولی اللٰہی، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی کوششوں سے، جو ایک دنیائے علم و عمل آباد ہوئی تھی، جب اس کی آبادیوں میں شکست و ریخت کے کچھ آثار ظاہر ہوئے، تو حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ، محنت اور کوششوں سے اس کی تجدید و تزئین ہوئی اور یوں اس روایت کا تسلسل جاری رہا۔

یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر ہندوپاکستان میں، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے بعد اتباع سنت اور رسوم وبدعات کی تردید میں کوئی اور آواز، اس قدر طاقتور، بلند بانگ نہیں تھی، جیسی حضرت مولانا گنگوہی کی تھی۔ حضرت مولانا نے اسی انداز وآہنگ میں، اس پیام کی تجدید کی اور اس پیغام کو، جس پر زمانہ گزرنے کے ساتھ، کچھ میل سا آنے لگا تھا، اس شان سے زندہ کیا، کہ وہ پھر اک نئی قوت، نئی طاقت اور مسلسل تحریک بن کر، متحرک اور رواں ہوگیا۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے حلقہ تربیت سے جو افراد اٹھے، ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے علماء اور اصحاب معرفت کی تھی، جنہوں نے اس دعوت وپیام کو اپنا نصب العین بنا کر، اپنی زندگیاں اس کی جدوجہد اور اس کی تبلیغ وترویج کے لئے وقف کردی تھیں اور اپنی سادگی، بے نفسی اور بے غرض کوشش سے، اس کی جڑیں بہت دور تک اور اس طرح گہرائی تک پہنچادی تھیں، کہ ان سے خود بخود نئی کونپلیں، نئے نئے پودے، پھوٹتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں، فکر وعمل کے نئے گلستاں آباد ہوتے رہتے ہیں، جس میں ایسی شادابی تازگی اور مہک ہوتی ہے، کہ امت کا ایک بڑا طبقہ اس کے کیف سے آراستہ ہوکر، ان خوشبوؤں سے اپنا دامت بھر لینا چاہتا ہے اور اس چمنستان سے ملتے تحفوں کو دوسروں تک پہنچانا، اپنی سعادت وخوش بختی خیال فرماتا ہے۔ یہ نئے افراد اس تحریک کے ایسے ہی پرجوش خادم بنتے ہیں اور راہ شریعت وسنت پر اسی طرح قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے ہیں، جس طرح ان کے بزرگوں اور اس خانوادہ کے اکابر علماء نے چلنے کی کوشش کی تھی۔

حضرت مولانا نے، اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، دین کی خدمت، تعلیم وتدریس، اصلاح وارشاد اور معاشرہ کی برائیوں کو ختم کرنے میں گزارا، عقائد اور معاملات کے بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کی۔ فقہی مسائل ومباحث میں عوام وخواص کی رہنمائی، ان کے سوالات کے جوابات لکھنا، ان کے علمی وقلبی سوالات ومشکلات کے حل کی جستجو اور بھٹکے ہوئے آہو کو بہتر سے بہتر طریقے اور عمدہ سے عمدہ ترین تدبیر کے ذریعہ سے، صحیح راستہ پر لانے کی دن رات بلکہ تمام عمر متواتر جدوجہد، حضرت مولانا کا طغرائے امتیاز ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور مدارس اسلامیہ کی تاسیس کی جو روایت، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مبارک شخصیت سے شروع ہوئی تھی، اس کی سب سے زیادہ آبیاری اور سرپرستی حضرت مولانا گنگوہی سے ہوئی۔ ان مدارس کے ذریعہ سے علم وکمال اور خدمت قرآن وحدیث اور فقہ وشریعت کا جو دریا جاری ہوا اور اتباع دین وشریعت کی جو فضا قائم ہوئی اور جو باد بہاری چلی، اس میں بھی حضرت والا کے رسوخ فی العلم اور دعوت واتباع سنت کے گہرے اثرات ہیں، بہت بڑا بلکہ غیر معمولی حصہ ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی فرماتے تھے لیکن یہ بھی ایک

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ سے وابستگی کی وجہ سے، حضرت مولانا نانوتوی کا دیوبند میں کم وقت گذرا اور ابھی مدرسہ دیوبند کو قائم ہوئے دس برس بھی نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے جو مقاصد تھے، وہ سب پوری طرح بروئے کار نہ آنے پائے تھے، کہ حضرت نانوتویؒ رحلت فرماگئے، اس لئے حضرت مولانا گنگوہی نے اس کام، مقاصد اور منصوبوں کو مکمل فرمایا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد، حضرت مولانا گنگوہی دارالعلوم کے اور بعد میں مظاہر علوم کے بھی سرپرست بنائے گئے تھے، دونوں مدرسوں کے تمام معاملات میں، حضرت مولانا کی رائے قول فیصل اور حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اگرچہ حضرت مولانا گنگوہی دونوں مدرسوں کے آغاز کے وقت سے ہی دونوں معاملات میں مشیر اور کسی قدر دخیل بھی تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات کے بعد، مدرسہ دیوبند کے سرپرست اول بنائے گئے تھے، یہی مظاہر علوم سہارنپور میں بھی ہوا۔ اگرچہ مظاہر علوم کے سرپرستوں کی فہرست میں، حضرت مولانا کا نام دیر میں آیا، مگر مدرسے کے قیام کے وقت سے مدرسے کے ذمہ داران، خصوصاً مولانا محمد مظہر نانوتوی جو علم اور عمر کی بزرگی کے باوجود، حضرت مولانا کے نیازمند تھے، حضرت مولانا سے مشورہ فرماتے رہتے تھے۔

اس طرح ان دونوں مدرسوں کے تقریباً تمام اختیارات، حضرت مولانا گنگوہی کے پاس آگئے تھے اور یوں بھی دونوں مدرسوں کے اکثر ذمہ داران اور استاذ، حضرت مولانا کے دامن تربیت سے جڑے ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت مولانا کو دونوں مدرسوں کے اساتذہ اور طلباء کی تربیت کا وسیع موقع ملا، اور یہ دونوں مدرسے تقریباً ایک تہائی صدی تک، حضرت مولانا کی نگرانی اور سرپرستی میں رہے اور حضرت مولانا کی افکار و تعلیمات اور طریقہ تعلیم و تربیت کا نمونہ اور مثال بن گئے۔

حضرت مولانا کے حسن تربیت کے سبب، حضرت مولانا کے اخلاق و کردار کے محاسن فکر و خیال کے اثرات، اتباع سنت کی رعنائی اور دین خالص پر عمل کا جذبہ مولانا کے شاگردوں اور متوسلین میں گھر کر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی تدبر و دانائی، علم و عمل، فقہ و حدیث کی جامعیت اور اصلاح و تربیت کے ساتھ، معاشرتی خرابیوں کے خلاف جد و جہد اور تمام غیر دینی، غیر اسلامی آوازوں اور فتنوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بنیادی صفات بھی، دونوں مدرسوں کے ذمہ داروں اور استاذوں میں منتقل ہوگئی تھیں، جو دونوں مدرسوں کے لئے متاع بے بہا اور شہوار ثابت ہوئیں۔ ان مدرسوں کے اکثر طالب علموں نے صرف یہی نہیں کیا کہ ان محاسن کی قدر کی، ان کو سینہ سے لگایا، بلکہ ان کو اپنی زندگی کے سفر اور دینی خدمات کے لئے رہنما اور نمونہ بنالیا تھا یعنی حضرت مولانا گنگوہی کے فکر و مزاج کی خصوصیات و امتیازات، حضرت مولانا کے فیض تربیت اور صحبت کی برکت سے، ان مدرسوں کے متعلقین کے فکر و مزاج میں، اس طرح رچ بس گئی تھیں۔ ان کے وجود کا ایک ضروری حصہ بن گئی تھیں۔ اسی فکر و مزاج کو دیوبندیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہی ان مدرسوں اور ان کے وابستگان کے کام کی روح ہیں۔

وفات حضرت مولانا حوادث کے تسلسل کی وجہ سے، بہت ضعیف و کمزور تھے، مولانا عبدالحی حسنی نے، جو ۱۳۱۳ھ [۱۸۹۶ء] میں گنگوہ حاضر ہوئے تھے اور حضرت مولانا کی خدمت میں قیام کیا تھا، لکھا ہے:

"مولوی صاحب بہت ضعیف و نحیف ہیں، عمر کی حیثیت سے یہ ضعف نہیں، کیونکہ عمر ساٹھ سے کچھ ہی متجاوز ہوگی، بڑھاپے کے آثار نمودار نہیں ہیں، بلکہ بیماری کا ضعف ہے، چہرے سے نحافت معلوم ہوتی ہے" (۱)

اور اس کے بعد بھی بار بار مختلف امراض میں مبتلا ہوتے رہے، لیکن معمولات بدستور جاری رہے، صحاح ستہ کے کامل درس کا سلسلہ ۱۳۱۴ھ میں ختم فرمادیا تھا، تاہم اطراف پڑھ کر اجازات وغیرہ کی مشغولیت روز افزوں رہی عقائد واصلاح کی فکر اور اہل سلوک کی نگرانی و تربیت بھی قدیم معمول پر جاری تھی، ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۲۳ھ کی صبح جب فجر کی نماز کے لئے مسجد آئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ پیروں کی دو انگلیوں پر خون کے گہرے نشانات ہیں، فکر ہوئی کہ یہ کیا ہوا، نماز کے بعد دیکھا گیا تو جانماز جو موٹی اور تہ دار تھی، وہ بھی نیچے تک خون سے آلودہ تھی، خیال ہوا کہ کسی جانور نے کاٹا ہے، مگر یہ تحقیق نہ ہوئی کہ کس نے کاٹا ہے اگر چہ متوسلین نے توجہ دلائی مگر حضرت مولانا نے اس کو چنداں اہمیت دی، لیکن اس حادثہ کے بعد، کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہوتا، اسی طرح تقریباً پندرہ دن گزر گئے، ۲۷/ جمادی الاول [۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء] کو عشاء بعد یکلخت لرزہ اور بخار کا سخت حملہ ہوا، یہی درحقیقت مرض الوفات تھا۔ علاج کی تدبیریں ہوتی رہیں، ہر طرح کی دوائیں ہوئیں بہتر سے بہتر علاج کیا گیا، مگر: ان اجل اللہ اذا جاء لایؤخر۔

مرض نے شدت اختیار کر لی اور اسی میں جمعہ کی دوپہر کو جمعہ کی اذان کے وقت ۹/ جمادی الآخریٰ ۱۳۲۳ھ، ۱۱/ اگست ۱۹۰۵ء کو یہ آفتاب ہدایت غروب ہوگیا۔ اسی دن شام کو مغرب کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (۲)

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی، نگہبانی کرے

ورحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین وجزی اللہ ماجزی بہ الاخیار الکاملین الصالحین۔

محلہ سرائے کے قریب سپرد خاک کردیا گیا۔ حضرت مولانا کی وفات کے بعد، ان ہی دنوں میں مولانا مرغوب احمد

---

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص: ۱۳۰ [دہلی ۱۹۵۸ء]

حضرت مولانا گنگوہی کے مرض الوفات اور وفات کے مفصل حالات، مولانا حبیب الرحمن عثمانی [بعد میں، مہتمم دارالعلوم دیوبند] نے قلم بند کر کے، اخبار وکیل امرتسر میں چھپوائے تھے۔ [ضمیمہ، شمارہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء] اس کا عکس راقم سطور کے سامنے ہے۔

(۲) تذکرۃ الرشید ص ۳۲۱ حصہ دوم۔

لاجپوری نے، سیدنا حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا، تشریف آوری کا سبب دریافت کیا، ارشاد فرمایا:

"مولوی رشید احمد کو لینے آیا ہوں" (۱)

حضرت مولانا گنگوہی اپنوں اور پراؤں کی نظر میں حضرت مولانا گنگوہی کس مقام ومرتبہ کی شخصیت تھے اور حق تعالیٰ نے حضرت مولانا کو کیسا جامع صفات، جامع کمالات منبع علوم وبرکات بنایا تھا، اس کا حضرت مولانا کی حیات میں ہی اعتراف اور بلند الفاظ میں اظہار ہوگیا تھا، یہاں نمونہ کے طور پر چند عبارتیں اور اقتباسات نقل کئے جاسکتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ اس آفتاب کمالات کی توصیف میں، مخالف وموافق سب یک زبان تھے۔

جنید وشبلی وعطار ہم مست

حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کے ارشادات حضرت گنج اپنے دور کے اکثر علماء اور مشائخ کے مقتدا اور گویا امام کی حیثیت رکھتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز سے براہ راست تلمذ کی سعادت اور مولانا شاہ محمد آفاق نقشبندی، مجددی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ پورے ملک میں حضرت گنج مراد آبادی کے نیازمندوں اور مستفیدین کا بہت وسیع سلسلہ تھا، اور بڑے اکابر وعلماء، حضرت مولانا سے ملاقات وزیارت کو عزت وسعادت خیال فرماتے تھے۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادی، اپنے دور کے علماء میں سے حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور حضرت مولانا گنگوہی کے سب سے زیادہ قائل ومعترف تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا کی مجلس میں بزرگان دین کا تذکرہ ہورہا تھا کہ ایک شخص نے حضرت مولانا رشید احمد کے حالات دریافت کئے [اس کے جواب میں] حضرت مولانا گنج مراد آبادی نے یہ الفاظ فرمایا:

"مولانا رشید احمد کا کیا حال پوچھتے ہو، وہ تو دریا پی گئے اور ڈکار تک نہیں لیا" (۲)

ایک مجلس میں ارشاد ہوا:

"ایک میں ہوں اور دوسرے مولانا رشید احمد، تیسرے ایسا کوئی مل جائے تو ظلمت فلسفہ دور ہوجائے" (۳)

حضرت حاجی امداد اللہ کے کلمات عالیہ حضرت حاجی امداد اللہ نے حضرت مولانا کا اپنی کئی تصانیف

---

(۱) خواب کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: شیخ الاسلام، روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ص ۱۴۶۔ [طبع اول دہلی] نیز مدرسہ شاہی نمبر، مرتبہ مولانا مفتی سلمان منصور پوری ص: ۳۱۵۔ ماہنامہ ندائے شاہی مراد آباد۔ ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء

مولانا مرغوب الرحمٰن ان لوگوں میں سے ہیں جو حضرت کی وفات کے وقت گنگوہ میں حاضر تھے۔ ملاحظہ ہو: تذکرۃ المرغوب، مولفہ نبیرہ مرغوب باسم مرغوب ص: ۹۰۔ [مطبوعہ کفلیہ راج پور، گجرات بلاسنہ]

(۲) تذکرۃ الرشید ص: ۳۲۱، جلد دوم۔

(۳) ارواح ثلاثہ ص: ۳۲۸۔

اور تحریرات ومکتوبات میں نہایت اعتراف کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، ایک اقتباس گزر چکا ہے، ایک مفصل گرامی نامہ، اسی موضوع پر، اسی سلسلہ میں ارقام فرمایا تھا، اس میں فرماتے ہیں:

از فقیر امداد اللہ چشتی۔ بخدمت محبان۔ عموماً اندنوں بعض خطوط ہندوستان سے اس فقیر کے پاس آئے، ان میں یہ تحریر تھا کہ مولوی رشید احمد صاحب کے ساتھ بعض لوگ سوءظن رکھتے ہیں، کہ ہم مولوی صاحب کو کیسا سمجھیں۔ لہٰذا فقیر کی جانب سے مشتہر کرادو اور طبع کرادو، کہ مولوی رشید احمد صاحب عالم ربانی، فاضل حقانی ہیں، سلف صالحین کا نمونہ ہیں، جامع بین الشریعہ والطریقہ ہیں، شب وروز خدا اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی میں مشغول رہتے ہیں، حدیث پڑھانے کا شغل رکھتے ہیں، مولانا مولوی محمد اسحاق صاحب کے بعد میں، اس قسم کا فیض علم دین کا، مولوی صاحب سے جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں مولوی صاحب ایک فرد واحد ہیں، مسائل مشکلہ کی عقدہ کشائی مولوی صاحب سے ہوتی ہے، ہر سال میں پچاس آدمی کے قریب علم حدیث پڑھ کر، ان سے سند لیتے ہیں۔ اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں محو ہیں، محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عشق خداوندی میں مستغرق ہیں، حق گو ہیں: لایخافون لومة لائم کے مصداق ہیں، خدا کے اوپر پورے طور سے توکل رکھتے ہیں، بدعات سے پورے طور سے مجتنب ہیں، اشاعت سنت ان کا پیشہ ہے، بدعقیدوں کو خوش عقیدہ بنانا ان کا حرفہ ہے، ان کی صحبت اہل اسلام کے واسطے کیمیاء اور اکسیر اعظم ہے، ان کے پاس بیٹھنے سے اللہ یاد آتا ہے، یہی اللہ والوں کی علامت ہے، متقی اور تارک الدنیا ہیں، راغب الی الآخرۃ ہیں تصوف اور سلوک میں کامل ہیں، امیر وغریب ان کی نزدیک یکساں ہیں، سب کی طرف توجہ برابر ہے، لاطمع ہیں، فقیر نے جو کچھ ان کی ثنا میں ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے وہ حق، اور اب فقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے، ان کے ساتھ بہت زیادہ ہے، فقیر ان کو اپنے واسطے ذریعہ نجات کا سمجھتا ہے۔

میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو برا کہتا ہے، وہ میرا دل دکھاتا ہے میرے دو بازو ہیں، ایک مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم دوسرے مولوی رشید احمد صاحب، ایک جو باقی ہے اسکو بھی نظر لگاتے ہیں، میرا اور مولوی صاحب کا ایک عقیدہ ہے، میں بھی بدعات کو برا کہتا ہوں، جو مولوی صاحب کا امور دینیہ میں مخالف ہے، وہ میرا مخالف ہے، وہ خدا اور رسول کا مخالف ہے اور بعض جہلا جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے، طریقت اور ہے محض ان کی کم فہمی ہے۔ طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی

حاصل ہوجاتی ہے، قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلودہ ہے، تو پیشاب سے بھی صاف ہوجاتا ہے، اور گلاب سے بھی صاف ہوجاتا ہے، لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے۔

ولی اللہ کے پہنچاننے کے واسطے اتباع سنت کسوٹی ہے، جو متبع سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے، تو محض بیہودہ ہے۔ خرق عادات تو دجال سے بھی بہت ہوں گی، خدا فرماتا ہے: قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی جو رسول اللہ کا پیرو نہ ہووے اور مروج بدعات ہووے، وہ خدا کا دوست نہیں ہوسکتا، اس فقیر سے جو اہل علم محبت رکھتے ہیں یہ امر باعث اتباع سنت کے ہے، کسی کی مخالفت سے مولوی صاحب کا نقصان نہیں۔

آپ بے بہرہ ہے، جو معتقد میر نہیں

مولوی صاحب وہ شخص ہیں، کہ خواص کو چاہئے کہ ان کی صحبت سے مستفید ہوں اور ان کی صحبت کو خیر کثیر سمجھیں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ مولوی صاحب کی نسبت مجھے کوئی کلمہ بے ادبی کا نہ سناوے اور نہ تحریر کرے، مجھ کو ان امور سے سخت ایذا ہوتی ہے۔ عجب بات ہے کہ میرے لخت جگر کو ایذا پہنچاویں اور اپنے آپ کو میرا دوست سمجھیں، ہرگز نہیں! مولوی صاحب پکے حنفی المذہب صوفی المشرب ہیں، باخدا ولی کامل ہیں، ان کی زیارت کو غنیمت سمجھیں۔ والسلام امداد اللہ فاروقی

مہر حاجی امداد اللہ مکہ معظمہ ۲۵/ ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ (۱)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ارشادات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی، اگرچہ حضرت مولانا کے بچپن سے دوست، ہم مرشد اور بے تکلف تھے لیکن حضرت مولانا کی نگاہ میں، حضرت مولانا گنگوہی کا جو مرتبہ تھا وہ غیر معمولی تھا۔ حضرت مولانا نانوتوی نے اپنی کتاب ہدایۃ الشیعہ [مؤلفہ رجب ۱۲۸۳ھ۔ دسمبر ۱۸۶۶ء] کی تمہید میں، حضرت مولانا گنگوہی کا نام، بڑے القاب واحترام کے ساتھ درج کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

بندہ ہیچ مدان گمنام محمد قاسم نام، متخلص بخاکپائے علماء، ناظران وراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے، کہ اواخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سو تراسی ہجری میں، مخدوم العلماء، مطاع الفضلاء، مجمع الکمالات، منبع الحسنات، زیب طریقت، حامی شریعت، فخر احباب، افتخار اصحاب، ملجاء انام، مرجع خاص وعام، معلم قوانین اطاعت، وانقیاد، محرک سلسلہ رشد وارشاد، جامع کمالات ظاہری وباطنی، مخدومنا ومولانا، رشید احمد گنگوہی دام رشدہ وارشادہ۔ (۲)

(۱) اختر بہشت ص:۵۱، تاص:۵۳۔ (۲) ہدایۃ الشیعہ تمہید ص اول۔ [مطبع ہاشمی میرٹھ: ۱۳۰۱ھ]

اس تحریر کے تقریباً دس سال بعد مرقومہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

عزیز من انہ میں اس قابل کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں، البتہ دو چار بزرگوں سے عقیدت ہے، ایک تو جناب حاجی امداد اللہ صاحب، دوسرے شاہ عبد الغنی صاحب، ان کے بعد جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، ان بزرگوں میں سے جس کی محبت میسر آجائے غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو۔

۶/صفر ۱۲۹۴ھ از نانوتہ (۱)

مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی کی نظر میں مولانا کا مرتبہ

مولانا الہ آبادی، حضرت حاجی امداد اللہ کے ممتاز ترین خلفاء میں سے تھے، حضرت حاجی صاحب بھی مولانا کو اپنے خواص میں شمار فرماتے تھے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا الہ آبادی بہت سے مسائل ونظریات میں، حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ علماء سے واضح اختلاف رکھے تھے، اور یہ اختلاف معروف تھا، اس کے باوجود حضرت مولانا کے دل سے قدرداں اور نہایت مداح تھے۔ مولانا الہ آبادی کے سوانح نگار لکھتے ہیں:

''ایک مولوی صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ توحید کے متعلق گفتگو فرمائی، مولانا نے تشفی بخش جوابات دیئے، تو وہ بہت مسرور ہوئے اور انہوں نے کہا کہ مولانا گنگوہی کے یہاں مجھے یہ باتیں نہ ملیں۔ آپ نے ان سے ارشاد فرمایا، کہ مولانا گنگوہی بہت بڑے شخص ہیں، ان میں صحابہ کی شان پائی جاتی ہے۔ یہ صاحب جب مولانا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پورا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مولانا الہ آبادی نے انکساراً یہ فرمایا ہے، ان کو تو یہ کہنا چاہئے تھا، کہ رشید احمد ابھی اس مرتبہ میں نہیں ہے (یہ ان دو آدمیوں کے تعلقات ہیں، جن کے متعلق مختلف المسلک ہونے کی شہرت دی جاتی ہے)'' (۲)

مولانا الہ آبادی نے ایک حضرت مولانا تھانوی کے نام خط میں لکھا:

''آپ لوگ [یعنی حضرت مولانا گنگوہی وتھانوی] بڑے عالی ہمت، بلند حوصلہ ہیں۔ دولت دارین کے سرمایہ دار، جو کام کرنا چاہتے ہیں، تائید ایزدی رفیق ہوتی ہے، ہر کام بخیر وخوبی انجام پاتے ہیں۔ ہم نکمے، ہمارے کام نکمے، جس کام کا ارادہ کیا، کبھی انجام کو نہ پہنچا۔ اگر کچھ سرمایہ ہے بھی تو ناکامی، کمائی ہے، تو معصیت، بقائے اثر کے لئے کچھ ذریعہ ہے، تو روسیاہی اور شامت اعمال'' (۳)

(۱) مکتوبات اکابر دیو بند ص: ۵۵
(۲) سوانح شاہ محمد حسین الہ آبادی تالیف محمد الفاروقی ص: ۱۶۳، [الہ آباد: ۱۳۵۴ھ]
(۳) سوانح شاہ محمد حسین الہ آبادی ص: ۱۳۶، [الہ آباد: ۱۳۵۴ھ]

مولانا سید دیدار علی الوری کا نذرانہ محبت وعقیدت

مولانا سید دیدار علی الوری مشہور عالم اور فقیہ تھے، خصوصاً مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی، مولانا الوری کو ہندوستان کا سب سے بڑا فقیہ اور فقہ میں اپنا مربی سمجھتے تھے اور مسائل کی تحقیق وتصحیح کے لئے، مولانا الوری سے رجوع بھی کرتے رہتے تھے۔

لیکن فاضل بریلوی کو شاید اس کا علم نہیں تھا یا خیال نہیں رہا ہوگا، کہ مولانا الوری حضرت مولانا گنگوہی کے شاگرد اور فقہ میں خاص تربیت یافتہ تھے، مولانا الوری کا تا حیات حضرت مولانا گنگوہی سے نیاز مندانہ رابطہ رہا۔ مولانا الوری حضرت مولانا کو جب خط لکھتے، ایسے القاب وآداب لکھتے، جس سے حضرت مولانا کی کامل عظمت اپنے تلمذ اور نیازمندی کا اظہار ہوتا تھا، مولانا الوری کے فتاویٰ کے مجموعہ تحقیق المسائل میں، مولانا الوری کے، حضرت مولانا کے نام کئی خطوط موجود ہیں، ان کے سرنامے لائق مطالعہ ہیں۔ ایک خط کے آغاز پر لکھا ہے:

عالی خدمت، فیض موہبت، مولانا معظمنا، رافع السنّت، قامع البدعت، مولوی رشید احمد صاحب، ادام اللہ رشدہ۔(۱)

دوسرے خط کی ابتدا ملاحظہ ہو:

عالی خدمت، فیض موہبت، حضور مجمع النور، رافع السنّت، قامع البدعت، مصدر خیر وبرکت، مولانا مرشدنا مولانا رشید احمد صاحب، ادام اللہ رشدہ۔(۲)

اور پھر بعینہ یہی الفاظ تحریر ہیں:

عالی خدمت، فیض موہبت، حضور مجمع النور، رافع السنّت، قامع البدعت، مصدر خیر وبرکت، مولانا مرشدنا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی ادام اللہ رشدہ۔(۳)

ایک اور خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

عالی خدمت، قدوۃ العلماء، زبدۃ الاصفیاء، مولانا ومرشدنا، مولانا رشید احمد صاحب سلمہ اللہ۔(۴)

یہ سرنامے مولانا دیدار علی صاحب کے دل میں حضرت مولانا گنگوہی کی جلالت شان اور عظمت ومقام کے بہت بڑے گواہ ہیں، کسی اور شہادت وتحسین کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

---

(۱) تحقیق المسائل، مولانا دیدار علی الوری ص:۳

(۲) تحقیق المسائل، مولانا دیدار علی الوری ص:۷

(۳) تحقیق المسائل، مولانا دیدار علی الوری ص:۱۹ (۴) تحقیق المسائل، مولانا دیدار علی الوری ص:۳۸

مولوی نقی علی والد فاضل بریلوی، کے کلمات تحسین ایک وقت تھا کہ خود فاضل بریلوی کے والد، مولوی نقی علی خاں صاحب بھی، حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نیاز مندوں میں شامل اور ان کے مداح و معتقد تھے اور دونوں کو "بڑے عالم اور سچے مؤمن" لکھتے تھے۔(۱)

فاضل بریلوی کے ایک معتمد اور خلیفہ، مولانا ناصر شفیع کی شہادت اور بلند الفاظ فاضل بریلوی کے بہت ہی معتمد اور قریب ترین علماء میں، ایک اہم نام، مولانا ناصر شفیع رامپوری [رام پور منیہاران ضلع سہارنپور] کا بھی ہے، جو تا حیات فاضل بریلوی کے ساتھ رہے، بریلی میں انتقال ہوا، وہیں دفن کئے گئے۔ انہوں نے بھی اس کی گواہی دی ہے کہ پورے ملک میں، حضرت مولانا گنگوہی کا ہم پایہ کوئی نہیں۔ اپنی تالیف لمعۂ برق جلال میں لکھتے ہیں:

"اس خاندان عالیہ [صابریہ] میں جو کچھ علم و فضل، زہد و اتقاء، تصحیح عقائد اجتناب از بدعات ہے، بظاہر ہندوستان میں دوسری جگہ کم ہوگا، الا ماشاء اللہ! مولانا رشید احمد گنگوہی، قاضی محمد اسماعیل صاحب موجود ہیں، جن کے اتباع سنت کا حال پورے ملک میں ضرب المثل ہے۔(۲)

---

(۱) یہ کلمات تحسین مولوی نقی علی کی تالیف: تحفۃ المقلدین، مطبوعہ مطبع صبح صادق، سیتاپور کے ص: ۱۵ پر درج ہیں۔ ملاحظہ ہو: افسانۂ عبرت تالیف مولوی مشتاق احمد صاحب چرتھاولی۔ [مطبع قاسمی دیوبند۔ احمد آباد، گجرات۔ محرم ۱۳۳۸ھ]

یہ کتاب تحفۃ المقلدین اگرچہ ناپید نہیں ہے تاہم کم یاب ہے، مگر اب بریلوی اہل قلم اس کا بالکل تذکرہ نہیں کرتے بلکہ اس کو چھپانا اور گم نام کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولوی نقی علی صاحب پر جو ایک کتاب پاکستان میں چھپی ہے، اس میں بھی تحفۃ المقلدین کا نام نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل بریلوی احمد رضا صاحب نے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے نام اپنے ایک خط میں بھی، اس کتاب کی اپنے والد کی جانب نسبت سے انکار کیا ہے مگر یہ صاحبان بھول جاتے ہیں کہ

یہ باتیں ہیں جب کہ جب آتش جوان تھا

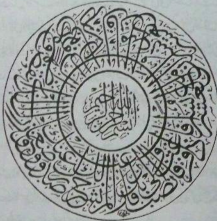
اس وقت مولوی نقی علی، سلسلہ دیوبند کے اکابر و علماء سے تعلق رکھتے تھے اسی وقت ان کی اور ان کے سلسلہ مارہرہ وغیرہ کے اصحاب کی جو مؤلفات و کتاب چھپتی تھیں، ان میں حضرت مولانا گنگوہی حضرت مولانا نانوتوی نیز علمائے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کا تعریف و تحسین سے تذکرہ ہوتا تھا، مگر فاضل بریلوی نے اپنے اس خط میں، ایسی تمام تالیفات کے وجود و ثبوت کا انکار کیا ہے اور اس کی ایک فہرست بھی درج کی ہے، ملاحظہ ہو: مکتوبات احمد رضا خاں بریلوی، مرتبہ پیر محمود احمد قادری ص: ۱۱۹ [لاہور: ۱۹۸۶ء] ان کو جعلی قرار دینا، بریلوی صاحب کی مجبوری ہے اگر وہ اس کا اعتراف کرلیں کہ ہمارے والد، بڑوں اور اہل مارہرہ کا اکابر علمائے دیوبند کی نسبت یہ خیال، یہ احترام اور یہ نیاز مندی کا معاملہ تھا۔ بگاڑ تو بعد میں اپنے خیالات و مفادات کی وجہ سے ہوا اس تغیر احوال اور اپنے صحیح ذہنی پس منظر اور تاریخ کو بھول جانے پر، اگر اصحاب دیوبند ان سے مخاطب ہو کر یہ شعر دہرا دیں تو شاید بے محل نہ ہوگا۔

اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

(۲) لمعۂ برق جلال [بجواب کرشمۂ جمال] تالیف مولانا شفیع ناصر صاحب ص: ۳۳ [مطبع حقانی لدھیانہ: ۱۳۰۷ھ]

مؤلف نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی کا مشاہدہ اور تاثر: ملک کے ایک ممتاز مورخ اور علماء واہل کمال کے بڑے تذکرہ نگار، مولانا حکیم عبدالحی حسنی رائے بریلوی نے اگر چہ نزہۃ الخواطر میں بھی، حضرت مولانا گنگوہی کا نہایت عمدہ جامع تعارف لکھا ہے مگر اصل وہ تحریر، تاثر اور مشاہدہ ہے، جو مولانا حسنی نے اپنے اطراف دہلی کے سفر نامہ میں لکھا ہے۔ حضرت کی رفاقت ومحفل کا حال، حضرت کے درس کی بات، حضرت کا ذاتی شرف وکمال، تورع واستقامت، اتباع سنت، ہر اک پر روشنی ڈالی ہے، آخر میں کہتے ہیں اور وہی گویا مقطع کا بند ہے۔ ملاحظہ ہو:

اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع واستقامت کا دوسرا شیخ، ان کے سوا اس زمانہ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا، علم الٰہی میں جو کوئی ہو، اس کی خبر نہیں۔ مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف تورع ہے، جو تمام اوصاف کو شامل ہے، کف لسان اور صدق گفتار میں، مولوی صاحب ضرب المثل ہیں۔ (۱)



(۲) دہلی اور اس کے اطراف ص: ۱۳۷

(۲)

فقہ وفتاویٰ نیز فتاویٰ رشیدیہ کے خطی اور مطبوعہ نسخے

حضرت مولانا گنگوہی کی دینی، علمی، فقہی، اصلاحی، تربیتی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس کا ایک ایک پہلو، اپنے اندر مختلف جہات اور اصلاح وتبلیغ کی مختلف نوعتیں لئے ہوئے ہوتا تھا، یہاں ایسے تمام پہلوؤں پر گفتگو کی گنجائش نہیں، تاہم یہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کی بڑی اور ممتاز ومؤثر فقہی خدمات اور کارناموں کو، بنیادی طور پر چار بڑے حصوں پر تقسیم کرلیا جائے اور ہر اک حصہ کا علیحدہ علیحدہ جزوی، اجمالی تذکرہ کیا جائے۔ یہ تقسیم وترتیب اس طرح ہوسکتی ہے:

(۱) فقہی موضوعات ومباحث پر تصنیفات ورسائل

(۲) روزمرہ کی ضروریات میں عوام کے سوالات اور علمائے کرام کے علمی فنی استفسارات کے جوابات [جس کا سلسلہ ایک دائمی معمول اور لازمی وظیفۂ حیات کے طور پر، زندگی کے تقریباً پچاس سال نصف صدی پر پھیلا ہوا تھا]

(۳) تصحیح عقائد، رسوم وبدعات اور ان کی شرعی حقیقت وحیثیت اور موقع بہ موقع، عوام میں پھیل جانے والی کسی بڑی بدعملی، دین وشریعت کے کسی اصول کی بے توقیری وخلاف ورزی اور فقہی معاملات ومسائل میں، عوام کی اطلاع اور واقفیت کے لئے، مفصل فتاویٰ کی تحریر وتالیف، ان کی اشتہار کی صورت میں اشاعت کا اہتمام اور پورے برصغیر کے مسلمانوں اور اہل علم وفلاح تک ان کو پہنچانے کی مسلسل کوشش۔

(۵) فقہ وفتاویٰ اور احکام شریعت کی صحیح ترین اور عمیق واقفیت، اس کی ہر ممکنہ حد آخری درجہ کا اہتمام، اس کی بقاء اور آئندہ نسلوں تک، اس جوہر خالص کو پہنچانے کے لئے علماء صاحب نظر، لائق اعتماد، خداترس اصحاب کی علمی عملی، تربیت کے بعد ان کے کام کی فکری نظریاتی سرپرستی اور ان کے لکھے فتوؤں کی علمی تصحیح ونگرانی، ناقدانہ نظر سے ان کا جائزہ اور ان کی فروگذاشتوں پر تنبیہ کا دائمی اہتمام۔

اگرچہ حضرت مولانا کی فقہی خدمات اور عالی مرتبہ کو جاننے کے لئے ان عنوانات کا مفصل تعارف اور جائزہ بے حد ضروری ہے مگر یہاں ان میں سے صرف عنوان نمبر: ۳-۲ کا کچھ تذکرہ کیا جائے گا۔

تصانیف: حضرت مولانا کی تصانیف ومؤلفات کا سرمایہ، شمار کتب اور صفحات کے لحاظ سے کچھ ایسا ضخیم اور بڑا نہیں ہے، تصانیف ومؤلفات کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے:

ولم تكن له كثرة اشتغال بالتاليف.(۱) [حضرت مولانا کا تصنیف وتالیف کا زیادہ معمول نہ تھا۔

دوسرے موقع پر لکھا ہے:

له مصنفات مختصرة قليلة منها تصفية القلوب وامداد السلوك ، وهداية الشيعة.

جو تصانیف ومؤلفات ہیں، ان کے صفحات بھی غیر معمولی اور ہزاروں میں نہیں ہیں، لیکن ان کے مندرجات اور مباحث ومضامین اللہ اللہ! جس کو علم دین خصوصاً حدیث وفقہ میں نظر ہو، دونوں کے مقاصد اور باہمی رشتہ کو کسی قدر پہنچانتا ہو اور علوم کے غوامض واسرار کی قدر کرسکتا ہو، اس سے پوچھئے کہ حضرت نے کس طرح اپنی ایک ایک تالیف وتحریر اور اکثر فتاویٰ کو بھی دریا بکوزہ کی مثال، اور ایک مثال وتخیل کو حقیقت کا پیراہن عطا فرمایا ہے۔ ایک ایک صفحہ کی بات نہیں، بعض بعض موقعوں پر ایک ایک فقرہ اور سطر، باخبر اور بہت ذہین پڑھنے والوں کو بھی محوحیرت کر دیتی ہے، کہ کس طرح پوری ایک کتاب کے مندرجات کو، ایک بحث کے مضامین کو، ایک فقرہ یا سطر میں سمو دیا ہے۔ یہی وہ کمال اور وصف ہے، جس کی حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نے ان الفاظ میں تعریف وتحسین فرمائی ہے، حضرت مولانا تھانوی کا قول ہے:

''مولانا گنگوہی دریا کو، کوزہ میں بند کرتے تھے اور مولانا نانوتوی کوزہ سے دریا نکالتے تھے'' (۲)

جس میں جس قدر علم وصلاحیت ہو، جس درجہ کی علمی بصیرت ہو، وہ اس سے اسی قدر وسیع، اور بے بہا نتائج اخذ کرسکتا ہے، اس کو پھیلا کر اس کی شرح بھی لکھ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے یہ تمام مؤلفات وکتب، اگرچہ اردو میں لکھی گئی ہیں، زبان بھی بہت مشکل، اور غیر مفہوم نہیں ہے مگر پھر بھی اکثر تصانیف کے لئے ضروری سا ہے، کہ ان کو کسی ذی استعداد عالم سے، خوب محنت اور گہری توجہ سے حل کیا جائے۔

حضرت مولانا نے تحریر وتصنیف کا کب آغاز کیا، اس کا سراغ نہیں ملتا، تاہم حضرت کی جو پہلی تصنیف معروف اور مطبوعہ ہے، وہ فقہ وفتاویٰ سے متعلق نہیں بلکہ عقائد اور کلام کے موضوع پر ہے۔ یہ ہدایۃ الشیعۃ ہے، جو ۱۲۸۱ھ میں لکھی گئی اور شائع ہوئی تھی، اس میں اہل تشیع کی جانب سے اہل سنت پر کئے گئے، چند اعتراضات کا سنجیدہ، علمی مدلل جواب ہے، جس

(۱) نزہۃ الخواطر ص: ۱۵۰۔ ج: ۸۔ [حیدرآباد]

(۲) جمیل الکلام، مجموعہ ملفوظات ص: ۲۲

کے مطالعہ سے مصنف کی گہری علمی فنی نظر اور پختہ قلم کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سے یہ تأثر بھی ملتا ہے کہ مصنف کی اور بھی علمی خدمات وتصانیف ہوں گی، جو محفوظ نہیں رہیں۔

(۱) فقہ وفتاوی پر حضرت مولانا کی سب سے پہلی دریافت ومطبوعہ کتاب، زبدۃ المناسک ہے، جو ۱۲۹۹ھ کی تصنیف ہے، اور اسی سال حضرت مولانا [نیز حضرت مولانا نانوتوی کے ایک ممتاز شاگرد] مولانا فخرالحسن گنگوہی کی کوشش سے، مطبع اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا کی صرف تین تالیفات ورسائل ایسے ہیں، جن کا سنہ تالیف معلوم ہے:

(۲) الرای النجیح فی عدد رکعات التراویح [مؤلفہ ۱۳۱۵ھ]

(۳) اوثق العری فی تحقیق الجمعۃ فی القری [مؤلفہ ۱۳۱۷ھ]

(۴) ردالطغیان فی اوقاف القران۔ [مؤلفہ ۱۳۱۷ھ]

اور دو مؤلفات ورسائل پر سنہ تالیف درج نہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) سبیل الرشاد فی التقلید و الاجتهاد.

(۲) الشمس اللامعہ فی کراھۃ الجماعۃ الثانیہ.

یہ جملہ رسائل اور تالیفات اگرچہ مختصر مختصر ہیں، مگران کی معنویت اور دینی فقہی مباحث میں، ان کی اہمیت اور نشان راہ ہونے کی وجہ سے، ان کی توضیحات کی گئیں، حاشیے اور شرحیں لکھی گئیں نیز ان کے تائیدات اور پھر ان کے جوابات وغیرہ پر بھی بیسیوں کتابیں وجود میں آئیں، مگر زیر سطر صفحات اس تفصیل کے متحمل نہیں ہیں، اللہ تعالی کو اگر منظور ہوا تو کسی اور وقت یہ گفتگو ہوگی۔

اگرچہ حضرت مولانا سے اور بھی بعض رسائل اور مختصر تالیفات منسوب ہیں، مثلاً: فتاوی میلاد، فتوی احتیاط الظہر، تحقیق الضاد والمصافحہ یا ممانعت وحلت زاغ وغیرہ، مگر یہ حضرت مولانا کی باقاعدہ تالیفات نہیں، بلکہ ان موضوعات پر صادر فتاوی ہیں، ان کو حضرت مولانا کے مختلف نیاز مندوں یا ناشرین نے، افادۂ عام کے خیال سے، علیحدہ مؤلفات کی صورت میں مستقل عنوان سے چھپوا دیا تھا، اس لئے ان کو حضرت مولانا کی باقاعدہ مؤلفات وتصانیف میں شمار کرنا صحیح نہیں۔

چند شاگرد: حضرت مولانا کی ذات گرامی سے، جو بے شمار دینی منافع ہوئے، خصوصاً ہندی ملت اسلامیہ کو جو رہنمائی ملی اور فکر وبصیرت کا خزانہ ہاتھ آیا، اس میں حضرت کی تصانیف ومؤلفات اور تحریرات وفتاوی کے ساتھ، حضرت مولانا کے عالی مرتبت شاگردوں کا بھی، بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ شاگرد اور تربیت یافتہ اصحاب کئی قسم کے تھے، حدیث شریف کی گرہ کشائی میں ماہر، سلوک وطریقت میں کامل، دینی شرعی مسائل کی واقفیت اور جواب دہی میں منفرد۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ ان میں

سے کسی ایک فن میں یگانہ روزگار تھے، کچھ ایسے جن کو دو چیزوں میں کمال اور بصیرت حاصل تھی اور بیشتر ایسے جوان میں سے ہر ایک منزل کے رہ نورد، ہر ایک دریا کے غواص اور حدیث وفقہ ہو، یا سلوک و معرفت، ہر اک کی، اعلیٰ درجہ کی بصیرت ونظر سے سرفراز اور ہر اک کی گرہ کشائی میں، اپنے عصر کے لئے نشان راہ اور مینارۂ نور ہے۔

یوں تو حضرت مولانا کے شاگردوں اور مستفیدین کی ایک بڑی تعداد ہے مگر یہاں صرف ان حضرات کے نام ذکر کئے جاتے ہیں، جنہوں نے حضرت مولانا کی خدمت میں قیام کر کے، ایک مدت تک فقہ وفتاویٰ کی تعلیم حاصل کی، فتاویٰ نویسی کے اصول جانے، اس کی عملی مشق کی، اور بعد میں خود ایسے ثابت ہوئے، کہ اب ان کے نام اور ان کے کام [عظیم الشان خدمات کے علاوہ] اور فقہ وفتاویٰ کی دنیا میں ان کا ایسا بلند مرتبہ ہے کہ ان میں سے بعض کے فتاویٰ اور فقہی ہدایات وسبق کو نظر انداز کر کے، صحیح سمت میں آگے بڑھنا سفر کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ [ناموں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے]

(۱) مولانا حافظ احمد [خلف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ]

(۲) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

(۳) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

(۴) حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی دیوبندیؒ

(۵) حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مہاجر مدنیؒ

(۶) مولانا صدیق احمد کاندھلویؒ

(۷) مولانا عبدالغفار صاحب اعظمیؒ

(۸) مولانا مفتی عبدالکریم پنجابیؒ

(۹) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی دیوبندیؒ

(۱۰) حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ

اسی فہرست میں مفتی اعظم، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ مفتی صاحب حضرت مولانا گنگوہی کے براہ راست شاگرد نہیں تھے، لیکن دارالعلوم دیوبند کے زمانہ تعلیم میں، حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور استفادہ کرتے رہتے تھے۔

ان حضرات میں سے ہر اک کی فقہی خدمات اور ان کے عہد میں ہندی ملت اسلامیہ پر، ان کے اثرات اور بعد کے اہل فتویٰ کا ان سے استفادہ ان کے طریقۂ کار اور روایت کی پاسداری کی تفصیلات، ایک ضخیم کتاب یا علیحدہ علیحدہ مفصل جامع مقالات کی طالب ہیں اور یہ صفحات اس کا محل نہیں ہیں۔

یہاں اس دلچسپ حقیقت کا بھی کچھ تذکرہ ہوجانا چاہئے، کہ فاضل بریلوی، احمد رضا خاں صاحب اپنے ہم نوا، جن اصحاب کی فقہ حنفی میں مہارت اور کمال کے معترف ہیں، وہ یا تو براہ راست حضرت مولانا گنگوہی کے شاگرد ہیں، یا حضرت مولانا کے شاگردوں سے مستفید ہیں جس میں مولانا سید دیدار علی الوری سرفہرست تھے۔

حضرت مولانا، احادیث کے متون پر نہایت گہری نگاہ، غیر معمولی وسعت نظر، رسائی ذہن اور دقت نظر سے کئی فقہی اختلافی بحثوں اور الجھے ہوئے معاملات ومسائل کو، اس طرح حل کیا اور ان کے بعض اہم گوشوں کا حسن استدلال اور معنویت سے لبریز، ایسا خوبصورت اور عمدہ تجزیہ فرمایا، کہ اہل علم ونظر حیران رہ گئے۔ حضرت مولانا کے ایسے فتاویٰ میں ندرت استدلال کے علاوہ، اس درجہ پختگی گہرائی جامعیت ہے کہ اس دور کے علماء نے، ان فتاویٰ کو، کمال فن فہم حدیث اور تفقہ کا ایک گراں بہا خزانہ قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا کے معاصر جلیل القدر علماء نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس طریقۂ اخذ واستنباط کو اپنے لئے نمونہ اور نشان راہ قرار دیا، بلکہ ان حضرات نے بھی، جو فقہی اختلافی مسائل میں دوسری رائے رکھتے تھے، اس حسن استدلال کی تحسین کی۔

حضرت مولانا سے عام مسائل اور روزانہ کے معمول کی چیزوں اور ضروریات کی نسبت، جب دریافت کیا جاتا تو مختصر جواب تحریر فرمانے کا معمول تھا، جو مسئلہ کی حد تک کامل اطمینان بخش مختصر الفاظ پر مشتمل، عموماً حدیث شریف کے متون اور فقہی کتابوں کے حوالوں اور جزئیات سے خالی، مگر ایسا پر مغز جامع اور پر از معنی ہوتا تھا، کہ اس سے اس مسئلہ کے عام جاننے والے دریافت کرنے والے کا، پورا اطمینان اور تشفی ہوجاتی ہے اور فقہ وفتاویٰ میں بصیرت اور فقہی متون پر نظر رکھنے والے بھی، اس کی گہرائی اور معنویت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتے تھے کہ، حضرت مولانا نے کم سے کم چند الفاظ میں مسئلہ کے تمام ضروری گوشوں کا احاطہ کرلیا ہے، بلکہ اصول دین وشریعت اور متقدمین فقہاء کے ارشادات واقوال کی مکمل ترجمانی بھی فرمادی ہے۔

مگر ہر اک مسئلہ اور ہر طرح کے فتاویٰ کے جوابات، ایک دو یا چند سطروں پر ہی مشتمل اور مختصر نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ سوالات جو توحید وعقائد، بدعات ورسوم، یا کسی اہم فقہی مسئلہ پر ہوں، جس میں اہل فتاویٰ کا اختلاف ہو، یا کسی دوسرے مسلک کے علماء کی تصریحات وتحریرات کی وضاحت کی ضرورت ہو، یا بدعات خصوصاً وہ بدعتیں، جو اس دور میں مولوی احمد رضا خانصاحب بریلوی کی وجہ سے عام ہورہی تھیں، ان کی پردہ کشائی کی ضرورت ہوتی، تو ایجاز واختصار کا معمول باقی نہیں رہتا تھا، ان پر مفصل گفتگو ہوتی، جس میں آیات شریفہ احادیث وآثار، ائمہ فقہاء کے اقوال اور فقہائے متقدمین ومتاخرین کی روایات نقل فرماتے ان کا درجہ واضح کرتے اور تمام پہلوؤں کو اس طرح منقح اور روشن فرمادیتے تھے، کہ منصف مزاج حقیقت کے طالب کو الجھن باقی نہیں رہتی تھی۔

ایسے مباحث میں حضرت مولانا، صرف معروف مآخذ واستدلال کا تذکرہ نہیں فرماتے، بلکہ کئی مرتبہ اس نظریہ کے ثبوت میں ایسے دلائل پیش فرماتے ہیں اور احادیث شریفہ کے الفاظ کی توضیح کے ساتھ، اس سے اس طرح استدلال کرتے ہیں، جو اگر چہ بالکل نیا ہوتا ہے، اس سے پہلے شاید ہی کسی محدث فقیہ یا عالم نے، اس سے اس مقصد کے لئے اس طرح استدلال کیا ہو، مگر جب حضرت مولانا کے طریقۂ تفہیم اور طریقۂ استدلال پر نگاہ جاتی ہے، تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا، کہ اس کا واقعۂ یہی مفہوم ہے، جو حضرت مولانا نے اخذ کیا ہے، جس پر آج تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔

حضرت مولانا، بلاشبہ فقہ حنفی کے ایک بڑے نمائندہ اور ترجمان تھے، لیکن اپنے عہد کے اکثر حنفی فقہاء سے نہایت مختلف، بڑے غواص، نہایت دیدہ ور، فقہ حنفی کے مآخذ وجزئیات کے نہ صرف جاننے والے، بلکہ ان کے حافظ، لیکن نہایت تحقیق وتنقید کے ساتھ۔ جس معروف فقہی روایات واصول میں، استدلال وانطباق کی کمی رہ جاتی ہے، اس کی تصحیح بھی کرتے ہیں اور حسب ضرورت تنقیح وتجزیہ بھی۔ حدیث شریف سے فن کی مطابقت اور اصول فقہ وحدیث کے تمام متعلقات سے گذار کر، چھان کر، کسی بڑے اہم مسئلہ کی تشریح فرماتے ہیں، تو اس کی سطر سطر بلکہ حرف حرف پڑھنے اور غور کرنے کا ہوتا ہے، اس کی مدد سے اس مسئلہ کے حل کے علاوہ اور بھی کئی مباحث ومسائل کو گہرائی تک جاننے اور ان کے حل کرنے میں مدد مل جاتی ہے، نیز اس طریقۂ کار سے رہنمائی حاصل کر کے اور مسائل کی تفہیم بھی آسان ہو جاتی ہے۔

بہر حال حضرت مولانا گنگوہی نے تقریباً چالیس پینتالیس سال تک، تحریر فتاویٰ میں مشغول بسر کئے۔ حضرت مولانا غالباً ۱۲۶۵ھ [۱۸۴۹ء] میں چار سال دہلی میں گذار کر، جب مولانا کی عمر اکیس سال تھی [ولادت ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ۔ ۱۱ مئی ۱۸۲۹ء] تعلیم مکمل ہونے پر وطن واپس آگئے تھے، (۱) اس وقت سے مختصر ملازمتوں کے دو موقعوں کے علاوہ، حضرت مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ، اپنے وطن گنگوہ [ضلع سہارنپور، یوپی] میں ہی گزرا، اور اگر چہ اس کی کوئی واضح شہادت یا اطلاع موجود نہیں، لیکن قرائن وآثار کہہ رہے ہیں کہ حضرت مولانا نے، اسی وقت سے خود کو، دینی علمی خدمات کے لئے گویا وقف کر دیا تھا، جس میں اور مصروفیات کے علاوہ عوام کی دینی مسائل میں رہنمائی اور مسائل وفتاویٰ کی تحریر کا عمل بھی جاری تھا، لیکن اس دور کے لکھے ہوئے فتوؤں کی نقل یا تفصیل دریافت نہیں، صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے فتاویٰ پر جلد ہی

---

(۱) تاریخ ولادت کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص: ۱۳۔ جلد اول [عکس طبع اول، سہارنپور: ۱۹۷۷ء] اور تذکرۃ الرشید میں یہ صراحت بھی ہے کہ:

"اس وقت جب آپ کی عمر شریف تخمیناً اکیس سال کی تھی، آپ کا زمانہ طالب علمی ختم ہولیا اور آپ نے اپنے وطن مالوف کی جانب مراجعت فرمائی" ص: ۳۵

"دہلی میں یہ زمانہ طالب علمی جتنا بھی آپ کو قیام کرنا پڑا، اس کی مدت کو دیکھئے کہ بمشکل چار سال ہوتی ہے" صفحہ بالا

اہل نظر کو اعتماد ہو گیا تھا، عوام کے سوالات کے علاوہ بھی، اس وقت کی تحریروں اور فتاویٰ پر، حضرت مولانا کی تصدیق وتائید کا درج ہونا استناد کی علامت سمجھی جاتی تھی اور یہ صرف مولانا کے وطن اور اس کے اطراف کی بات نہیں تھی، بلکہ نسبۃً دور دراز علاقوں خصوصاً پنجاب میں، تالیف اور شائع، متعدد مختصر تالیفات یا فقہی مسائل وموضوعات کے جوابات ورسائل پر، حضرت مولانا کی تائید وتصدیق اور مہر ثبت ہے، دہلی کے مطبوعہ چند رسائل وفتاویٰ پر بھی، حضرت مولانا کی تصدیق درج ہے، ایسے جو رسائل وفتاویٰ اس وقت تک میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں سب سے قدیم رسالہ جس پر، حضرت مولانا کی بحیثیت فقیہ ومفتی کے تصدیق مہر شامل ہے ۱۲۷۵ھ [۱۸۵۹ء] کا ہے، جو اس بات کی علامت ہے، کہ حضرت مولانا کا اس وقت تک، فقہی دنیا میں اعتبار واعتماد قائم ہو چکا تھا، (۱) اور اطراف ونواح کے علاوہ، دور دراز علاقوں میں بھی، حضرت مولانا کا نام ایک جید، صاحب اعتماد مفتی کی حیثیت سے جانا پہنچانا جاتا تھا، مسائل وفتاویٰ پر مولانا کی مہر دیکھ پڑھ کر، اس پر اعتماد ہو جاتا تھا۔ حضرت مولانا کی دقت نظر اور فقہ وفتاویٰ میں بلند پردازی کے ساتھ ساتھ، حضرت مولانا سے رجوع اور اعتماد میں متواتر اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک حضرت مولانا کی حیثیت بنگال سے صوبہ سرحد اور بلوچستان تک، ایک بڑے معتمد اور دیدہ ور اور محتاط مفتی کی ہو گئی تھی اور حضرت مولانا فقہ وفتاویٰ پر بھی، امام عصر اور مرجع اہل نظر تسلیم کر لئے گئے تھے۔

اگر چہ حضرت مولانا کے فتوے، ملک کے دور، خطوں تک معروف ومعتمد شمار ہوتے تھے اور کتب ورسائل کے علاوہ اشتہارات کی صورت میں چھپ کر بھی، بہت دور، دور تک پہنچتے اور لوگوں کے لئے اصلاح وعمل کا ذریعہ بنتے تھے، مگر اس دور میں، حضرت مولانا کے فتاویٰ کی نقل رکھنے اور ان کے جمع کرنے کا کوئی اہتمام ہوا ہو، راقم سطور کو اس کا سراغ نہیں ملا۔ حضرت مولانا کے فتاویٰ کے نقل کرنے اور یکجا فراہم کرنے کا سلسلہ، اس وقت شروع ہوا، جب حضرت مولانا نے، دوسرے سفر حج سے واپسی کے بعد [غالباً محرم ۱۲۸۲ھ جون ۱۸۶۵ء] میں، حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں، خصوصاً صحاح ستہ کے درس کا ارادہ کیا، جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی دور دراز کے علاقوں سے جید فاضل، ماہر مدرسین، نہایت ذی استعداد فارغین اور طلبہ، حضرت مولانا کے درس حدیث میں شرکت کے لئے گنگوہ آنے لگے۔ ان طلبہ کے ذریعہ سے حضرت مولانا کے علم وعرفان کا فیضان، ایک بڑے دریا کی صورت میں جاری ہوا، اور اس کے پر بہار واثرات وثمرات کی خوشبو، برصغیر ہند کی سرحدوں سے گذر کر دور تک پہنچی، ملکوں ملکوں سے طلبہ درس حدیث کیلئے گنگوہ آئے، جو اپنے اپنے انتظام اور سہولت کے مطابق، گنگوہ میں قیام کر کے، حضرت کے درس حدیث میں حاضر ہوتے اور اپنے دامن کو علم وکمال کے جواہرات سے مالا مال کرتے تھے۔

---

(۱) لیکن بعض کتابوں پر تقریظات اس سے بھی پرانی ہیں، مثلاً مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی کتاب دلائل الاذکار حضرت مولانا گنگوہی کی تقریظ ہے، جو ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء کی مؤلفہ ومطبوعہ ہے۔

ان طلبہ کو، جب حضرت کے حدیثی افادات وارشادات کی، خاص معنویت، گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوا، تو ان افادات ومطالب کو محفوظ قلم بند کرنے کے، سلسلہ کا بھی آغاز ہوا، اسی وقت حضرت کے فتاویٰ کی نقلیں رکھنے کا سلسلہ شروع ہوا، اس سلسلہ کا سب سے پہلا مجموعہ، کس نے مرتب کیا اس کا تذکرہ آسان نہیں ہے لیکن راقم سطور کو جن چند مجموعوں کا علم ہے، ان میں سب سے پہلا مجموعہ افادات وہ ہے، جو مولانا اشرف الحق دہلوی نے ۱۳۰۳ھ [۸۶-۱۸۸۵ء] میں مرتب وقلم بند کیا تھا۔ اس وقت سے حضرت مولانا کی وفات، بلکہ بعد تک، حضرت مولانا کے فتاویٰ کی جمع وترتیب ہوتی رہی، کل کس قدر مجموعے مرتب ہوئے، ان کی صحیح تعداد بھی معلوم نہیں، لیکن اس ذخیرہ میں سے، بارہ چودہ، چھوٹے بڑے مجموعوں کا، مجھے تعارف یا سراغ ملا ہے۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

نسخہ دہلی: مولانا اشرف الحق صاحب، دہلی کی پنجابی برادری سے تعلق رکھتے تھے، دہلی کے اساتذہ سے ابتدائی تعلیم کے بعد، مدرسہ دیو بند [دارالعلوم] کے اساتذہ وعلماء، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور [شیخ الہند] مولانا محمود حسن صاحب وغیرہ سے اعلیٰ درسیات کی تعلیم مکمل کی، حدیث شریف کے درس واختتام کے لئے، حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، غالباً دو سال تک گنگوہ میں قیام کیا، جس میں سے خاصا وقت، حضرت مولانا کے دولت کدہ پر گزرا، اس دوران حضرت مولانا سے حدیث کی اعلیٰ کتابیں، خصوصاً دورہ حدیث شریف، بہت عمدہ طریقہ پر پڑھا اور مکمل کیا۔

مولانا اشرف الحق صاحب نے اس قیام کے دوران یہ فیصلہ کیا تھا، کہ وہ حضرت مولانا کی درس کی تقریریں محفوظ وقلمبند کریں گے، اس کے علاوہ حضرت مولانا کے فتاویٰ کی نقلیں رکھنے کا بھی اہتمام کیا، حضرت مولانا کے ارشادات وملفوظات بھی لکھتے رہے، اس طرح مولانا اشرف الحق نے ایک بڑا ذخیرہ یک جا کر لیا تھا، جو فل سکیپ {A/4} ناپ کے ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھا، جس میں حضرت کے تقریباً پانچ سو فتاویٰ بھی درج تھے۔ مولانا اشرف الحق کے فرزند، امداد صابری صاحب نے لکھا ہے کہ:

"اس قلمی کتاب میں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاویٰ رشیدیہ حمیدیہ کے ۴۸۷ [چار سو ستاسی] فتوے نقل کئے ہیں"(۱)

یہ مجموعہ افادات وتقاریر ۴-۱۳۰۳ھ [۸۶-۱۸۸۵ء] میں قلم بند ہوا۔ مولانا اشرف الحق نے اسی مجموعہ میں، حضرت مولانا کا رسالہ کراہت جماعت ثانیہ [القطوف الدانیہ] بھی نقل کیا ہے، اس کے آخر میں تاریخ تحریر اور گنگوہ میں اسی قیام کا واضح تذکرہ کیا ہے۔ تحریر ہے:

(۱) داستان شرف، سوانح مولانا اشرف الحق، تالیف امداد صابری صاحب ص: ۲۰۰۔ دہلی

"اضعف العباد، شرف الحق، خادم الدین دہلوی، بہ شب سہ شنبہ بماہ محرم الحرام ۱۳۰۳ھ، بہ مکان مولوی ابوالنصر اور مولانا رشید احمد۔"(۱)

یہ مجموعہ جس میں حضرت مولانا کے بہت اہم اور خاص فتوے درج ہوئے ہیں، امداد صابری صاحب مرحوم کی وفات [یکم ربیع الاول ۱۴۰۹ھ/۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء] تک محفوظ تھا، اس کے بعد، اس قیمتی نسخہ پر کیا گزری، کہاں گیا، کچھ معلوم نہیں۔ بظاہر علوم معارف کا یہ گنجینہ ضائع ہو چکا ہے، ان کے ورثا سے بار بار رابطوں کے باوجود اس کا سراغ نہیں ملا، کیا کہا جائے، فانا للہ و انا الیہ راجعون.

میری دلی دعا اور تمنا ہے اور قارئین کرام بھی اس میں شامل ہوں اور اس پر آمین کہیں، کہ یہ گوہر گرانمایہ ضائع نہ ہوا ہو، کہیں محفوظ ہو اور شائع ہو کر، اہل علم وذوق کی تسکین کی خاطر اور رہنمائی کا سامان بن جائے۔

۲- مجموعہ مرتبہ مولانا عبدالغفور چندیانوی، مکتوبہ ۱۳۱۱ھ: حضرت مولانا گنگوہی کے گم نام شاگردوں میں سے ایک عالم، مولانا عبدالغفور صاحب چندیانوی بھی تھے۔ چندیانہ، موجودہ ضلع بلند شہر مغربی یوپی کا ایک قصبہ ہے، یہاں کئی اہل علم پیدا ہوئے، ان میں سے مولانا چندیانوی بھی تھے، مولانا عبدالغفور صاحب نے بھی، حضرت مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کا ایک نسبۃً مختصر مجموعہ مرتب کیا تھا۔

یہ مجموعہ چھوٹی پیمائش کے ایک کم سو (ننانویں) صفحات پر مشتمل ہے، فی صفحہ گیارہ سطریں ہیں، سادہ رواں نستعلیق قلم ہے، جو بہت عمدہ اور پختہ نہیں ہے۔ اس میں حضرت مولانا گنگوہی کے تینتیس فتوے نقل ہوئے ہیں، آخر میں ایک مفصل فتویٰ میلاد کے موضوع پر فارسی میں ہے، یہی اس مجموعہ کا سب سے مفصل فتویٰ ہے، جو نو صفحات پر مشتمل ہے، [ص:۹۱ سے ص:۹۹] مگر اس فتوے کے آخر میں حضرت مولانا گنگوہی کے نام کی صراحت نہیں، اسی فتوے کے اختتام پر یہ مجموعہ بھی مکمل ہو گیا ہے۔ آخر میں کاتب نسخہ نے اپنا نام اور تاریخ کتابت تحریر کی ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

"تمام شد، راقم الحروف، المعروف والمشہور، سراپا قصور راجی رحمت ربہ الغفور، بندہ عبدالغفور چندیانوی۔

روز سہ شنبہ مورخہ ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ مطابق ۲ جنوری ۱۸۹۴ء۔"

نسخہ چندیانوی، پاکستان میں، انجمن ترقی اردو، کراچی کے ذخیرۂ خاص میں محفوظ تھا، اور اب یہ تمام گلشن انجمن کی لائبریری سے نیشنل میوزیم، کراچی میں منتقل ہو گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو، کراچی کی فہرست مخطوطات میں، اگرچہ اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے، مگر کتاب کا نام، مصنف، سنہ کتابت سب غلط لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

(۱) داستان شرف، سوانح مولانا شرف الحق، تالیف امداد صابری صاحب ص:۲۰۰، دہلی

رسالہ فقہ

صفحات ۹۹ سطور ۱۱ سنہ تصنیف قبل از ۱۲۶۲ھ

سنہ کتابت ۱۲۶۲ھ

مزید تحریر ہے:

"زیادہ تر جوابات مولوی رشید احمد گنگوہی کی جانب سے ہیں، اور کمتر مولوی محمد یعقوب نانوتوی کی جانب سے۔"(۱)

خطہ شکستہ اور رواں ہے۔ مطبوعہ فہرست کے آخر میں ترقیمہ مصنف بھی نقل کیا ہے، مگر اس میں بھی سنہ تحریر غلط درج ہوا ہے۔ مرتب فہرست مخطوطات انجمن نے، یہاں بھی اس نسخہ کا سنہ کتابت ۱۲۶۲ھ ہی لکھا ہے۔(۲)

یہ کتاب جس کا یہاں تذکرہ ہوا ہے، درحقیقت مجموعہ فتاوی حضرت مولانا گنگوہی ہے، جس میں سے صرف ایک فتویٰ [جس کی صراحت گزری] مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا شامل ہے۔ اس کے آخر میں صاف لکھا ہے:

"کتبہ الراجی رحمت ربہ محمد یعقوب النانوتوی"

بہر حال یہ مجموعہ مولانا عبدالغفور چندیانوی کے قلم سے ہے، ترقیمۂ کاتب، فہرست مخطوطات انجمن میں بھی نقل ہوا ہے، مگر اس میں بھی سنہ تالیف درج کرنے میں، سہو ہوا ہے، اس میں شامل ایک بھی فتوے کی تاریخ تحریر یا ترتیب و کتابت کا، ۱۲۶۲ھ سے کچھ تعلق نہیں، ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ ۱۲۶۲ھ میں تو مولانا گنگوہی بالکل نوعمر تھے، دہلی میں تعلیم مکمل کر رہے تھے، اس لئے ممکن ہی نہیں کہ اس دور میں، حضرت مولانا نے کوئی فتویٰ لکھا ہو، اس کے مجموعہ کا مرتب ہونا، اس کی نقل و ترتیب تو دور کی بات ہے۔ اصل نسخہ کے ترقیمہ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۳۱۱ھ [۱۸۹۴ء] کا مرتبہ و مکتوبہ ہے۔

راقم سطور کو اس نسخہ کا فوٹو اسٹیٹ، اس وقت انجمن ترقی اردو کے معتمد خصوصی [صدر نشیں] عالمی شہرت یافتہ دوہا گو، شاعر، جناب جمیل الدین عالی صاحب کی عنایت سے ملا تھا، میں نے اس کے مصارف اور ڈاک خرچ بھیجنا چاہا، تو عالی صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ: "میرا بھی اس کار خیر میں کچھ حصہ ہو جائے گا" اس علم پروری کے لئے عالی جی، انجمن ترقی اردو اور نیشنل میوزیم، کراچی کا ممنون ہوں، شکریہ۔

۳- مجموعہ مولانا نظیر حسین، فرخ آباد۔ مکتوبہ غالباً ۱۳۲۱ھ فرخ آباد، یوپی کے ایک عالم، مولانا نظیر حسین صاحب کا، حضرت مولانا گنگوہی سے خاص رابطہ رہتا تھا، فقہی سوالات علمی مسائل و مباحث کے لئے حضرت مولانا

(۱-۲) مخطوطات انجمن ترقی اردو۔ مرتب افسر صدیقی امروہوی ص:۸۲ جلد دوم۔ [کراچی: ۱۹۶۷ء]

8

سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا اپنے معمول کے مطابق ان کے جوابات لکھتے تھے، مولانا نظیر حسین صاحب نے جو ناپیدا تھے، اپنے اکثر خطوط و سوالات اور حضرت مولانا کے جوابات، ایک مجموعہ میں یک جا نقل کرا لئے تھے، مگر اس کا جو فوٹو اسٹیٹ دستیاب ہے، وہ مکمل نہیں ہے۔ خیال یہ ہے کہ مولانا نظیر حسین صاحب نے کسی کاتب و ناقل سے حضرت مولانا گنگوہی کے زیر تعارف فتاویٰ اور مکتوبات کے علاوہ اور بھی چند کتابیں یا رسالے ایک مجموعہ کے طور پر نقل کرائے ہوں گے لیکن اس مجموعہ فتاویٰ کے ساتھ اور رسالے شامل نہیں، بظاہر ان کو اس مجموعہ سے علیحدہ کرلیا گیا اور صرف فتاویٰ کا یہ عکس میرے ہاتھ میں ہے۔

زیر نظر مجموعہ درمیان پیمائش کے بتیس ورق یا چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، نستعلیق پختہ تحریر ہے، عموماً فی صفحہ سولہ سطور ہیں، بعض صفحات پر کم و زائد بھی ہیں، چند صفحوں کے حاشیوں پر سوال نامہ یا جواب کا کچھ حصہ نقل ہوا ہے، سرورق کے بعد جو صفحہ ہے، اس کا مکتوب دہم سے آغاز ہوا ہے، اور اس کے کونہ پر ورق نمبر درج ہے صفحہ اکیس کا نشان بھی واضح ہے، یعنی اصل مجموعہ میں سے، دس مکتوبات و فتاویٰ یا بیس صفحات اس عکس میں موجود نہیں ہیں، مگر اس کے بعد کے اکثر صفحات کی ترتیب فوٹو اسٹیٹ صاف نہ ہونے کی وجہ سے واضح نہیں رہی، شبہ ہوتا ہے کہ درمیان سے بھی بعض صفحات اور مسائل کے جوابات غائب ہیں، چند مکتوبات پر شمار درج ہے، بعض پر نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نظیر حسین کا حضرت مولانا سے، علمی استفادہ اور خط و کتابت کا سلسلہ خاصا طویل تھا۔ اور یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مجموعہ میں، مولانا نظیر حسین صاحب کے دریافت کئے، تمام سوالات کے جوابات شامل نہیں کئے گئے، اس کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات امہات المومنینؓ کے اہل بیت میں شامل ہونے کے موضوع پر، ایک سوال کا جواب جو حضرت کے ایک اور قلمی مجموعہ فتاویٰ [مجموعہ کلاں ورق: ۲۵ب۔ مخطوطہ قدیم] میں درج ہے، وہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہے۔

اس مجموعہ میں شامل، حضرت مولانا گنگوہی کے ایک خط کے آخر میں، ۱۰ جمادی الاخری ۱۳۱۸ھ/ [۱۵ اکتوبر ۱۹۰۰ء] تاریخ کتابت رقم ہے، اور اس مجموعہ کے شمار کے لحاظ سے یہی اس مجموعہ کا آخری خط بھی ہے، اور اس خط کے آغاز پر مکتوب سی و ششم [۳۶] کا اندراج واضح ہے، یعنی اس مجموعہ میں شامل حضرت مولانا کے جملہ مکتوبات و فتاویٰ، وسط ۱۳۱۸ھ تک کی یادگار ہیں۔

مولانا نظیر حسین نے ان مکتوبات و فتاویٰ کو کتابی صورت میں، کس سے اور کس وقت مرتب و یکجا کرایا، زیر نظر فوٹو اسٹیٹ سے کچھ پتہ نہیں چلتا، لیکن اسی فوٹو اسٹیٹ کے پہلے صفحہ پر، مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے، کسی کاتب کے قلم سے یہ الفاظ تحریر ہیں:

"کتبہ عبدالرحیم فرخ آبادی، ماہ محرم الحرام ۱۳۲۱ھ"

کاتب کا یہ نام اور تاریخ اختتام کتابت، غالباً اس مجموعہ فتاویٰ کے ساتھ نقل، کسی اور کتاب پر درج ہوگی، جو اسی کاتب کے قلم سے لکھی ہوئی ہوگی، جس نے یہ مجموعہٗ فتاویٰ مرتب اور نقل کیا ہے، اس لئے مولانا فریدی صاحب نے یادداشت کے لئے، اس نسخہ مکتوبات وفتاویٰ پر لکھوا دیا ہوگا، یعنی کہا جاسکتا ہے کہ یہ مجموعہ فتاویٰ بھی ۱۳۲۱ھ [اپریل مئی ۱۹۰۴ء] کا مکتوبہ ہے۔

۴۔ نسخہ سہارنپور، مکتوبہ در حیات حضرت گنگوہی: حضرت مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کے، حضرت مولانا کی حیات میں مرتب و دریافت مگر غیر مطبوعہ، قلمی نسخوں میں، سب سے اہم جامع اور مفصل ترین، مجموعہ وہ ہے، جو کتب خانہ مظاہر علوم سہارنپور میں محفوظ ہے۔(۱) یہ نسخہ اگرچہ اول آخر سے کسی قدر ناقص ہے، شروع کے غالباً دو ورق یا تین صفحات غائب ہیں۔ آخر میں مضمون تو مکمل ہے مگر ایسا خیال ہوتا ہے کہ کاتب و ناقل [یا مرتب] کا کچھ اور بھی لکھنے کا ارادہ تھا، مگر اس کا موقع نہیں ملا اور یہ اہم کام آخر سے ناتمام رہ گیا۔ اس نسخہ پر مرتب و ناقل کا نام اور تاریخ و سنہ کتابت موجود نہیں۔

تاہم یہ نسخہ حضرت مولانا کے غیر مطبوعہ فتاویٰ کا نہایت ہی قیمتی مجموعہ ہے، جس میں مسائل و مباحث کا تنوع، ان کی تعداد، نیز علمی استدلالی پہلو سے افادیت و معنویت اور تمام نسخوں سے بہت زیادہ ہے۔ حضرت مولانا کے دست مبارک سے موجود فتاویٰ کے بعد، غالباً حضرت کے فتاویٰ کا کوئی اور مجموعہ اس کا ہم پایہ، اس وقت تک دریافت نہیں ہوا۔

یہ نسخہ ۲۰/۱۵ سینٹی میٹر پیمائش کے دو سو چوالیس صفحات پر مکمل ہوا ہے، فی صفحہ عموماً تیرہ یا چودہ سطر آئی ہیں، تحریر صاف نستعلیق ہے، کاتب کے قلم سے، قلم کی یکسانیت اور طبیعت کے ٹھہراؤ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ اس میں مرتب اور کاتب کا نام اور سنہ ترتیب و تحریر درج نہیں مگر اس کے مندرجات سے واضح ہے، کہ یہ نسخہ حضرت مولانا گنگوہی کی زندگی میں جمع اور نقل کیا گیا تھا۔ اندرونی صفحات میں، حضرت مولانا کے دستخط کی صراحت کے بعد: "مدظلہ العالی، مولانا مدظلہم۔ تحریر جناب مولانا صاحب مدظلہ" صاف لکھا ہوا ہے، اور اس کے درج دو فتوؤں کے ضمنی اندراجات سے یہ بھی تاثر ملتا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۳۰۰ھ اور اس کے بعد کے چند سال کے فتاویٰ پر مبنی ہے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس میں ایک فتوے پر، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصدیق درج ہے، "الاجوبۃ صحیحۃ محمد یعقوب نانوتوی" [ص:۱۲، قلمی] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی [ربیع الاول ۱۳۰۲ھ، ۲۲ دسمبر ۱۸۸۴ء] میں وفات ہوگئی تھی، یعنی یہ فتویٰ اس سے پہلے لکھا گیا تھا،

(۱) ہماری بدقسمتی اور ملت کے افتراق و انتشار کے مزاج کا شاخسانہ اور ایک بڑا اثر یہ بھی ہے کہ ہمیں بڑے دینی اداروں اور رہنماداروں کے ناموں کے ساتھ نامبارک و ناپسندیدہ تقسیم کا نشان لگانا پڑتا ہے، اور اس کے بغیر ہمارے افتراق پسند مزاج کا اطمینان اور تسلی نہیں ہوتی، اس لئے عرض کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ مدرسہ کے قدیم کتب خانہ میں اس عمارت میں ہے، جو مدرسہ مظاہر علوم کی سب سے پہلی یا باقاعدہ عمارت اور یادگار ہے، اسی میں دفتر تھے اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ کی سب سے پرانی مسجد بھی ملحق ہے۔

ایک اور موقع پر سوال کرنے والے نے وضاحت کی ہے: "آج بروز بدھ، دو فروری ۱۸۸۷ء" [ص:١٢٠ قلمی] یہ تاریخ ٨ جمادی الاول ١٣٠٤ھ کے مطابق ہے، اس ترتیب کا اگر خیال کیا جائے، تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد کے فتوے بھی، اسی دور کی یادگار ہوں گے۔

یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کا مرتب یا کاتب، حضرت مولانا کی خدمت کا حاضر باش، شاگرد یا خصوصی تعلق رکھنے والا فاضل ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے: "تقریر مولانا مدظلہ العالی" یہ تقریر عقائد کے موضوع پر، ردجہمیہ وغیرہ کے نکات پر مشتمل ہے، جن کا عام لوگوں کے لئے سمجھ لینا بھی آسان نہیں۔ اس کو صحیح محفوظ اور قلم بند کر لینا تو خاص صلاحیت اور فہم کے بغیر، متوقع ہی نہیں۔

حضرت مولانا کے خودنوشت فتاویٰ کے بعد، راقم سطور کے مرتبہ زیر نظر مجموعہ باقیات کا، یہی سب سے بڑا اور مرکزی ماٰخذ ہے۔

۵- نسخہ رام پور، مکتوبہ بعد از وفات حضرت مولانا: حضرت مولانا کے غیر مطبوعہ فتاویٰ کے چند نسخوں میں سے ایک مختصر سا مجموعہ وہ ہے، جو مدرسہ فرقانیہ رام پور کے علمی ذخیرہ میں موجود ہے، یہ مجموعہ فل سکیپ {A/4} پیمائش کے صرف انتیس (٢٩) صفحات پر مشتمل ہے، فی صفحہ پندرہ سطور آئی ہیں، غالباً لکھنے والے دو صاحبان ہیں، دو علیحدہ قلم صاف محسوس ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ کے سرورق پر لکھا ہے:

"فتاویٰ شتی، از مولانا رشید احمد صاحب"

مگر اس میں حضرت مولانا کے علاوہ چند اور صاحبان کے فتاویٰ بھی شامل ہیں، بعض فتوے ایسے ہیں جن کی مولانا نے صرف تحسین فرمائی ہے، تاہم چند فتوے ایسے بھی ہیں، جو اور مجموعوں میں موجود نہیں، اس لئے اس نسخہ کی ایک جزوی اہمیت ہے، اگر چہ اس پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت کی صراحت نہیں مگر ایک جگہ لکھا ہے:

"غلط مسئلہ کا رواج حضرت قدس سرہ کو نہایت گراں گزرتا تھا" [ص:١٦]

جو اس کی شہادت ہے کہ یہ حضرت مولانا کی وفات کے بعد جمع اور نقل کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ مدرسہ فرقانیہ، رام پور یوپی کے ذخیرہ میں موجود ہے، اس ذخیرہ کے فہرست نگار کی اطلاع ہے کہ یہ نسخہ حضرت نانوتوی کے ایک بہت ممتاز شاگرد مولانا سید احمد حسن امروہوی کے قلم سے ہے۔(١) اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو بلا شبہ اس مجموعہ کا حضرت گنگوہی کے معتمد ترین فتاویٰ میں شمار کیا جائے گا۔ مگر اس نسخہ کے فوٹو اسٹیٹ پر ایسی کوئی علامت وصراحت موجود نہیں، جو اس اطلاع کی تصدیق کرتی ہو۔

---

(١) کتب خانہ فرقانیہ اور اس کے مخطوطات مرتبہ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی ص:٢١، مرتب فہرست مخطوطات نے اس مجموعہ کو فتاویٰ رشیدیہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ نمبر شمار: ١٥ [مشمولہ، ماہنامہ ضیائے وجیہ، رام پور۔ جون ١٩٩٤ء]

۶۔نسخہ حسن پور: ایک اور مختصر مجموعہ فتاویٰ، جس پر کاتب وناقل کا نام اور سنہ کتابت وغیرہ، کچھ درج نہیں ہے مگر کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ حضرت مولانا گنگوہی کے خلیفہ، مولانا احمد شاہ صاحب حسن پوری (حسن پور ضلع مراد آباد۔ یوپی) کے ذخیرہ کی باقیات میں سے ہے، مگر تعجب ہے کہ اس مجموعہ میں ایک بھی نیا فتویٰ یا افادہ نہیں ہے، اس میں درج تمام فتوے نسخہ چندیانوی میں موجود ہیں، اس لئے نسخہ حسن پور کا بصرف ایک ضمنی حوالہ کے طور پر تذکرہ اور استعمال کیا جا سکتا ہے، راقم نے بھی یہی کیا ہے۔

۷۔اوراق کراچی: حضرت مولانا گنگوہی کے افادات اور فتاویٰ کا ایک چھوٹا سا نسخہ قومی عجائب گھر کراچی، میں بھی ہے، جس کا فہرست مخطوطات اردو۔ قومی عجائب گھر میں ان الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے:

"تقطیع ۲۴½×۱۵½ س۔م۔ اوراق ۷۔ سطور ۱۴۔ خط نستعلیق معمولی، سنہ کتابت اوائل بیسویں صدی عیسوی، قیاساً کاتب نامعلوم۔ (۱)

اس مجموعہ کے بیشتر صفحات، حضرت مولانا کے ہمولانا خلیل احمد انبیٹھوی کے سوالات کے جوابات میں، یا اس میں مولانا انبیٹھوی کے نام مکتوبات نقل ہیں، لیکن آخری تین صفحوں میں ایسے فتاویٰ بھی ہیں جو کسی اور مجموعہ میں نہیں ملے، مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی سے مراسلت اور ان کے شبہات کے جوابات کا ایک حصہ، تذکرۃ الخلیل میں شائع ہو چکا ہے، تاہم اس مجموعہ کی کمیاب تحریریں لائق اخذ واستفادہ تھیں، راقم نے ان کو اس مجموعہ میں شامل کر لیا ہے، اوراق کراچی سے یہی صفحات مراد ہیں۔ ان صفحات کا عکس جناب راشد شیخ صاحب، کراچی کی عنایت سے ملا، جس کے لئے تہ دل سے ممنون ہوں، جزاہ اللہ خیرا۔

۸۔درج بالا مجموعوں کے علاوہ متفرق قلمی فتاویٰ حضرت مولانا کے بہت سے فتوے، جو خود حضرت مولانا کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں اور بعض مہر سے بھی آراستہ ہیں مختلف اصحاب کے ذخیروں میں موجود ہیں، بیس سے زائد فتاویٰ جو حضرت کے قلم سے علیحدہ علیحدہ اوراق پر لکھے ہوئے ہیں، راقم کے ذاتی ذخیرہ کی زینت ہیں، ان میں سے بعض پر حضرت کی مہر بھی ہے، ایک فتویٰ ایسا بھی ہے، کہ جو اگرچہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی کے قلم سے ہے، مگر اس پر حضرت کی مہر ثبت ہے۔ ہمارے قدیم گھریلو ذخیرہ میں، حضرت مولانا گنگوہی کی صرف یہی ایک یادگار، یا تحریر محفوظ تھی۔

لاہور میں شاہ نفیس الحسینی صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں بھی، حضرت مولانا کے دو تین خود نوشت فتاویٰ تھے، شاہ صاحب نے راقم کو ان کا عکس عنایت کیا۔ ایک دو فتوے، (حضرت کے فرزند مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی کے نواسے (ڈاکٹر سید معین الرحمان صاحب (لاہور، پاکستان) کے گھر میں موجود تھے، جو انہوں نے شائع کر دیئے تھے، ان کے علاوہ بھی متعدد فتاویٰ مختلف

(۱) فہرست مخطوطات اردو قومی عجائب گھر کراچی، (پاکستان) ص ۵۹ مرتبہ ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب (کراچی ۱۹۹۰ء)

مقامات پر متعدد اصحاب کے پاس موجود ہیں، ان میں سے جو مجھے فراہم ہو سکے وہ تمام اس مجموعہ میں شامل ہیں، باقی ماندہ کے لئے کوشش جاری ہے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

۹- چند متفرق قلمی فتوے: فتاویٰ حضرت مولانا گنگوہی کے درج بالا غیر متعارف و غیر مطبوعہ مجموعوں کے علاوہ حضرت کے چند نادر، غیر مطبوعہ فتوے ایسے بھی ہیں، جو ان میں سے کسی بھی مجموعہ میں نقل نہیں لیکن ان کی علیحدہ علیحدہ معتبر نقول، حضرت مولانا کے تلامذہ، منتسبین یا معتبر اہل علم و کمال کے قلم سے موجود ہیں، اس طرح کے جو فتاویٰ مجھے ملے، ان کا متن حسب ترتیب ابواب کتاب میں شامل کر دیا ہے، علیحدہ علیحدہ متعارف غیر ضروری معلوم ہوا۔

۱۰- چند فتاویٰ کے معتبر قلمی نسخے: حضرت مولانا کے فتاویٰ کے چھوٹے بڑے، مرتب نسخوں کے علاوہ دس بارہ فتوے ایسے بھی دستیاب ہوئے، جو اگرچہ نہ خود حضرت مولانا کے قلم سے ہیں، نہ ہی کسی مرتب مجموعہ میں شامل ہیں۔ بلکہ یہ ایک ایک، دو دو فتوے، علیحدہ علیحدہ، لائق اعتماد علماء کے قلم سے نقل ہیں۔ یہ فتوے بھی حسب موقع اس مجموعہ میں آ گئے ہیں، ساتھ ہی ان کا مفصل حوالہ بھی دیدیا ہے۔

● **مطبوعہ مگر نادر و کم یاب فتاویٰ:** حضرت مولانا کی کم سے کم دو تالیفات یا مفصل فتوے [جو کتابی صورت میں چھپے] اور ان کے علاوہ بھی پچاسوں فتوے ایسے ہیں، جو حضرت مولانا کی حیات میں شائع ہو گئے تھے، مگر ان کا عموماً کہیں تذکرہ نہیں آتا [تذکرۃ الرشید اور معروف فتاویٰ رشیدیہ میں بھی، ان کا تعارف یا نقل شامل نہیں] مثلاً:

۱۱- الف: فیض رشیدیہ اس میں حضرت مولانا کے تحریر کئے ہوئے، چالیس سوالات یا فتاویٰ کے جوابات شائع کئے گئے تھے۔ مگر اس میں نہ اس کی وضاحت ہے کہ یہ سوالات کس نے کئے تھے اور نہ یہ کہ فیض رشیدیہ کا مرتب کون ہے، اس پر کوئی تمہید، وجہ اشاعت یا سنہ اشاعت چھپا ہوا نہیں ہے، اس کے سرورق پر صرف حضرت مولانا گنگوہی کا نام نامی تحریر ہے اور یہ لکھا ہے:

"حسب فرمائش حاجی خدا بخش صاحب پانی پتی، مطبع فخر المطابع، میرٹھ میں بہ اہتمام منشی فخر الدین چھپا"

اس طباعت میں نہایت معمولی گھٹیا کاغذ استعمال ہوا ہے۔

فیض رشیدیہ میں درج ہر اک جواب کے اختتام پر، حضرت مولانا کے دستخط یا مہر کی علامت بنی ہوئی ہے، سب سے پہلے اور آخری فتوے کے بعد، اس نواح کے معروف علماء کے دستخط بھی شامل ہیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ یا مجموعہ فتاویٰ ۱۳۱۰ھ [۹۳-۱۸۹۲ء] میں چھپا ہوگا، مگر تعجب ہے کہ حضرت مولانا کے احوال و سوانح پر لکھی گئی

کتابوں اور فتاویٰ میں، اس کا کہیں تذکرہ نہیں ملا۔ اس نہایت نادر اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، دو تین نسخے اور بھی معلوم ہیں۔

۱۲-ب: فتاویٰ عشر یہ چار صفحہ کا مختصر سا کتابچہ ہے، جو فیض رشیدیہ کے اکثر نسخوں کے آغاز پر لگا ہوا ہے، اس میں عشر کے متعلق گیارہ سوالات اور حضرت مولانا کے جوابات درج ہیں، جواب کے اختتام پر بیسیوں علماء کی تصدیقات اور مہریں وغیرہ نقل کی گئی ہیں، اس میں سے ایک مہر میں تاریخ تحریر ۱۳ر شوال ۱۳۰۹ھ [۹۳-۱۸۹۲ء] موجود ہے، جس سے واضح ہے کہ یہ فتاویٰ بھی اسی سال رقم فرمائے گئے تھے۔

یہ مختصر رسالہ نامور مرشد، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی فرمائش پر، حضرت مولانا رائے پوری کے ایک خاص متوسل اور خدمت قرآن مجید میں، حضرت مولانا رائے پوری کے دست راست، مولانا نور محمد صاحب حقانی لدھیانوی [مؤلف نورانی قاعدہ] نے اپنے مطبع حقانی اسلامی، لدھیانہ سے شائع کیا تھا۔ لکھا ہے:

"یہ استفتاء جناب مخدومی مکرمی، معظمی مولوی حاجی حافظ عبدالرحیم شاہ صاحب، مہتمم مدرسہ اسلامیہ رائے پور ضلع سہارنپور نے مرتب کرایا ہے، چونکہ اکثر کاشتکار اہل اسلام اس مسئلہ سے بے خبر ہیں، لہٰذا احقر العباد، نور محمد، مہتمم مدرسہ حقانی نے، اپنے مطبع میں چھاپ کر شائع کیا۔ امید ہے کہ جو صاحبان اس سے فائدہ اٹھائیں، مولانا موصوف اور احقر کو دعاء خیر سے یاد فرمائیں"

۱۳-ج: رسالہ تحقیق الضاد والمصافحہ: یہ ایک مختصر سا بیس صفحات کا رسالہ ہے، جس میں مصافحہ کے مسنون طریقہ اور ضاد کی ادائیگی کے عنوان پر، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی، حضرت مولانا گنگوہی نیز بعض اور علماء کے فتاویٰ، یک جا شائع کیے گئے ہیں۔ سرورق پر لکھا ہے:

فتاویٰ جامع معقول و منقول مولانا رشید احمد صاحب سلمہ و مولانا عبدالحی صاحب مبرور۔ المسمی بہ:

تحقیق الضاد و المصافحۃ"

یہ رسالہ [مولوی] حفیظ اللہ بیگ صاحب کی فرمائش سے، مطبع گلزار ابراہیم، مراد آباد سے ۹ر شوال ۱۳۰۷ھ [اواخر مئی ۱۸۹۰ء] میں چھپا تھا، اس میں درج حضرت مولانا کے فتاویٰ بھی کم یاب ہیں اور میری معلومات کے مطابق، اب تک کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیے گئے۔

۱۴- حضرت کی زندگی میں شائع کچھ متفرق فتوے: ایسے فتاویٰ کی بہ ظاہر خاصی بڑی تعداد ہوگی، جو حضرت مولانا کی موجودگی میں مختلف دینی فقہی تالیفات و رسائل میں، حضرت مولانا کی خاص تحریر کے طور پر، یا اس مسئلہ کی

تصدیق میں شائع کئے گئے۔ اس وقت اس طرح کی تالیفات اور رسائل کی ایک تحریر واشاعت کا عام ذوق تھا، جس میں حضرت مولانا اور سلسلہ ولی اللہی کے متوسلین پیش پیش رہتے تھے، اوران پر حضرت کی تصدیق یا فتوے کی شمولیت، یقیناً اس کتاب کے علمی وزن میں اضافہ کا اور قبول عام کا ذریعہ بنتی تھی، بہر حال حضرت مولانا کے یہ فتاوی، ان کتابوں کے اوراق میں، پوشیدہ اور بکھرے ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ ان کی تعداد سینکڑوں میں ہوگی، مجھے محدود مطالعہ اور محدود ترین وسائل کے باوجود، ایسے پچیس سے زیادہ فتاوی ملے، جو اس مجموعہ میں حسب موقع شامل ہیں، ان کا تعارف بھی ساتھ ہی درج ہے، کوئی اللہ کا بندہ تلاش کرے، تو حضرت مولانا گنگوہی کے اور پچاسوں فتوے ملیں گے۔

احکام شریعت رسوم وبدعات اور عقائد ومسائل کی وضاحت پر، شائع کئے ہوئے اشتہارات

حضرت مولانا گنگوہی صرف مسائل کے جاننے بتانے کی حد تک مفتی اور فقیہ نہیں تھے، بلکہ حضرت مولانا ایک بہت بڑے دینی مصلح بھی تھے، پورے ملک میں مسلمانوں میں عقیدہ کا جو بگاڑ، رسوم وبدعات کے اہتمام کی وجہ سے جو خرابیاں اور معاملات کے شرعی احکام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے جو غلط طریقے رواج پارہے تھے، حضرت مولانا، ان پر بہت دور تک، بڑی گہری اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے۔ جب پورے ملک میں عموماً اور کسی خاص خطہ میں خصوصاً عقیدہ کے کسی پہلو سے کمزوری سامنے آتی، کسی نئی بدعت اور طریقہ کا رواج بڑھتا، یا عام مسلمانوں میں کسی بھی، فقہی شرعی پہلو کی جانب سے بے خبری یا بے توجہی کا مشاہدہ اور علم ہوتا اور اس سلسلہ میں کثرت سے سوالات اور استفتاء آتے، تو ان سوالات کے مجموعی مندرجات سے ایک سوال مرتب کرکے، یا کسی جامع ترین سوال کو سامنے رکھ کر، اس کا مفصل جامع جواب تحریر فرماتے اور اس جواب کو، اپنے دستخط اور مہر سے مزین فرما کر، اشتہار کی صورت میں شائع کرادیتے تھے اور پھر وہ اشتہار سفر کرتا ہوا، بنگال سے افغانستان وترکستان تک پھیل جاتا تھا اور بفضلہ تعالیٰ اس کی یہ رہنمائی اور اطلاع، نہایت مفید وکارآمد ثابت ہوتی تھی اور جو کام علاقہ میں موجود، بڑے واعظین اور اہل دین کے لئے مسئلہ بنا ہوا ہوتا تھا، وہ اس کی وجہ سے حل ہوجاتا اور اکثر لوگ حضرت کے فتاوی کو بلاتکلف مانتے، قبول کرتے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

اس مبارک سلسلہ کا حضرت نے کب، کس موقع سے آغاز فرمایا تھا، مجھے اس کا سراغ نہیں ملا، لیکن ۱۳۰۰ھ[۸۳-۱۸۸۲ء] کا مطبوعہ اشتہار [فتویٰ] معلوم ہے، اور اس وقت سے حضرت کے وفات کے قریب تک، اس طرح کے اشتہارات مختلف موضوعات ومباحث کی مناسبت سے متواتر چھپتے رہے، ایسے کل کس قدر فتاوی یا اشتہارات، حضرت کی جانب سے یا حضرت کے نام سے چھپے، اس کی تحقیق بھی آسان نہیں۔ تاہم حضرت مولانا کے اس قسم کے متعدد اشتہارات کا مختلف علمائے کرام نے، اپنی تصنیفات ومؤلفات میں ذکر کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

(۱) "المھند علی المفند" میں حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی مہاجر مدنی نے، مرزا قادیانی کے سلسلہ میں، حضرت مولانا گنگوہی پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے، لکھا ہے:

"وفتوی شیخنا ومولانا رشید احمد الگنگوھی رحمہ اللہ فی کفر القادیانی، قد طبعت وشاعت، یوجد کثیر منھا فی ایدی الناس"(۱)

اور ہمارے شیخ اور رہنما، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ قادیانی کے کافر ہونے کے متعلق شائع ہوکر عام ہو چکا ہے، اس کے نسخے کثرت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں

اس میں جس فتویٰ کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ فتاویٰ رشیدیہ میں شامل نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ اشتہار کی صورت میں چھپ کر تقسیم ہوا تھا، اس کی تصدیق خود مرزا قادیانی کی تحریروں سے بھی ہو رہی ہے۔ مرزا قادیانی نے انوار اسلام میں لکھا ہے:

ایک فیصلہ کرنے والا اشتہار انعامی ہزار روپیہ، میاں رشید احمد گنگوہی وغیرہ کی، ایمانداری پرکھنے کے لئے، جنہوں نے اس عاجز کی نسبت یہ اشتہار شائع کیا ہے، کہ یہ شخص کافر اور دجال اور شیطان ہے، اور اس پر لعنت اور سب وشتم کرتے رہنا ثواب کی بات ہے، اور اس اشتہار کے وہ سب مکفر مخاطب ہیں، جو کافر اور اکفر کہنے سے باز نہیں آتے (۲)

دوسری جگہ کہتا ہے:

اسی طرح مولوی رشید احمد گنگوہی اٹھا اور ایک اشتہار میرے مقابل پر نکالا اور جھوٹے پر لعنت کی اور تھوڑے دنوں کے بعد اندھا ہو گیا، دیکھو اور عبرت پکڑو (۳)

(۲) زمینداره ختم ہونے سے پہلے، کاشتکاروں کے لئے، حق موروثیت کا ایک سرکاری ضابطہ تھا، جو خلاف شریعت تھا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا کا ایک فتویٰ، اشتہار کی صورت میں چھپ کر عام ہوا تھا، یہ فتویٰ مولانا محمد خطیب دیوبندی [ناظم جمعیۃ اسلام، دیوبند] کے پاس موجود تھا۔ مولانا نے اپنی تالیف رسالہ زمیندارہ بل میں، حضرت مولانا گنگوہی کا یہ مفصل فتویٰ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

---

(۱) المھند علی المفندص: ۸۲۔ [مکتبہ حنفیہ جامع مسجد گنبد والی جہلم]

(۲) انوار اسلام ص: ۲۶۔ طبع اول۔ نیز روحانی خزائن [مجموعہ تالیفات مرزا قادیانی] ص: ۴۷ جلد نمبر: ۹

(۳) نزول المسیح ص: ۳۲ [طبع اول اگست ۱۹۰۹ء] نیز روحانی خزائن [مجموعہ مؤلفات مرزا] ص: ۴۰۹ جلد: ۱۸]۔ مرزا صاحب کی کتابوں میں حضرت مولانا کا، کئی جگہ نام آیا ہے، اگرچہ وہ سب عبارتیں اور حوالے راقم کی نظر میں ہیں مگر یہاں ان کی ضرورت نہیں، تاہم ان سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ مرزا قادیانی، حضرت مولانا کو اور بہت سے علماء کی طرح، اپنا سخت ترین مخالف، بدترین دشمن اور ناقد کہتا اور سمجھتا تھا۔

"یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کے زمانہ میں بصورت اشتہار شائع ہوا تھا، یہ مطبوعہ اشتہار دفتر جمعیۃ اسلام میں محفوظ ہے"(۱)

اشتہار کی صورت میں شائع، دو فتاویٰ جو میرے پاس موجود ہیں خود راقم سطور [نور الحسن راشد کاندھلوی] کے ذخیرہ میں بھی، حضرت کے اس طرح کے دو اشتہار یا فتوے موجود ہیں، ان کا کسی قدر مفصل تعارف حاضر ہے، جس سے حضرت مولانا گنگوہی کے اس طریقہ کی افادیت اور تفصیل سامنے آئے گی۔

(الف) پہلا فتویٰ یا اشتہار نکاح بیوگان کے سلسلہ میں ہے۔ اس دور میں اس موضوع اور خدمت پر علماء کرام اور مصلحین کی خاص نظر رہتی تھی اور وہ نکاح بیوگان کے احیاء کے لئے متواتر کوششیں فرماتے رہتے تھے، منجملہ ان کے حضرت مولانا گنگوہی بھی تھے۔ حضرت مولانا کے اس موضوع پر کئی فتوے صادر ہوئے اور حضرت مولانا نے عملی طور پر بھی، اس کے لئے جدو جہد فرمائی، اسی کی ایک خاص تحریک اور جدو جہد کے موقع پر شائع، زیر تعارف فتویٰ بھی ہے۔

یہ فتویٰ "اعلان ضروری" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا، جو چون ۵۴ سینٹی میٹر لمبا، چھتیس سینٹی میٹر چوڑا اور تقریباً پچاس سطروں کے، مفصل مضمون پر مشتمل ہے۔ اس میں اول ایک تمہید ہے، اس میں بیوہ عورتوں کے نکاح کی فضیلت بیان کی گئی ہے، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کے نکاحوں کی تفصیلات، ایک نقشہ کی صورت میں واضح کی گئی ہیں، اس کے بعد نکاح بیوگان کی فضیلت اور اس کے اثرات اور منافع کا مزید تذکرہ ہے، اس کے تحت:

"فتویٰ مولانا رشید احمد گنگوہی معہ مواہیر و دستخط دیگر علمائے اہل سنت"

کے جلی عنوان سے، حضرت مولانا گنگوہی کا مفصل فتویٰ درج ہے، جس میں نکاح بیوگان کی ضرورت اور اس کی مخالفت کرنے والوں کا شرعی حکم، وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس فتوے پر اسی علاقہ کے، بیسیوں علماء کی مفصل و مختصر تصدیقات ثبت ہیں، آخر میں مختلف بستیوں کے ایسے ذمہ داران کے نام لکھے ہیں [جو بیشتر راجپوت برادری سے تعلق رکھتے ہیں] جنہوں نے ان کے اس فتوے کی تائید کی تھی اور نکاح بیوگان کو رواج دینے کے لئے کوشش کا ارادہ کیا تھا۔

یہ اشتہار مولوی پیر محمد صاحب سہارنپوری کی فرمائش پر، مطبع مجتبائی دہلی سے، ۶/ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ [۴/ اگست ۱۸۸۹ء] کو چھپا تھا۔

(ب) ایک اور اشتہار ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے، یہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کی تالیف: "فیصلہ ہفت مسئلہ" میں میلاد کے موضوع پر ہے۔ اس میں حضرت حاجی صاحب کی رائے کی نسبت سوال کیا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) رسالہ زمیندار اوبل، مرتبہ مولانا محمد خطیب دیوبندی، حاشیہ ص: ۱۱، مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس دہلی: ۱۳۶۶ھ - ۱۹۴۷ء

''چوں کہ فیصلہ ہفت مسئلہ سے اکثر لوگوں کو شبہ ہوتا ہے، اس لئے اسکے متعلق رسالہ ہفت مسئلہ جو مطبع نظامی میں طبع ہوا ہے، (۱) اور حضرت حاجی صاحب سلمہ کی طرف سے منسوب ہے اور اس میں اہل بدعت کی تائید اور اہل حق علمائے دین، محققین کی مخالفت کی گئی ہے، آیا اس کا حضرت حاجی صاحب مدظلہم کی جانب منسوب ہونا درست ہے یا نہیں! علاوہ اس کے اس پر عمل کرنا اور ترغیب دلانا درست ہے یا نہیں''؟

حضرت مولانا نے اس کا مفصل جواب دیا ہے، جس میں بتایا ہے کہ، حضرت حاجی صاحب کو رسوم اہل زمانہ کی خبر نہیں، کہ وہ ان زائد چیزوں اور بے اصل باتوں کو، کس قدر ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن آخر میں یہ صراحت بھی ہے کہ:

''حضرت سلمہ کے عقائد ہرگز بدعت کے نہیں ہیں، کہ اہل فہم و دانش خود عبارت رسالہ سے سمجھ سکتا ہے''

اس اشتہار پر ناشر مطبع یا سنہ طباعت کا اندراج نہیں، صرف آخر میں حضرت مولانا کے دستخط اور مہر ہے۔ اسی پر یہ اشتہار یا فتویٰ ختم ہوگیا ہے۔

دو اشتہار اور: حضرت مولانا کے فتاویٰ پر مشتمل ایسے دو اشتہار جو اور مضامین و عنوانات پر مشتمل تھے، ایک جگہ سرسری نظر سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا، خیال تھا کہ بعد میں ان کا فوٹو مل جائے گا مگر وہ صاحب جن کے پاس یہ فتوے تھے، اچانک وفات پاگئے، بعد میں ان اشتہارات سے استفادہ ممکن نہ ہوا۔

ایسے اشتہارات و فتاویٰ کا ایک بڑا ذخیرہ: یہاں دلی افسوس کے ساتھ یہ بھی لکھ رہا ہوں، کہ میں نے ایک کتاب خانہ یا علمی ذخیرہ میں، ایسے اشتہارات کا ایک خاصا بڑا مجموعہ یا بنڈل دیکھا تھا، جس میں حضرت مولانا گنگوہی کے شائع کئے ہوئے اور حضرت کے فتاویٰ کی اشتہار نما اشاعتیں برسہا برس کی طویل محنت و تلاش کے بعد، جمع کی گئی تھیں۔ یہ اشتہار اندازاً، ستر پچھتر تو یقیناً تھے، ممکن ہے اور زیادہ ہوں، مگر میں اس نہایت بیش قیمت، نادر الوجود خزانہ کا عکس لینے سے قاصر رہا، اور اب تلاش کیا تو یہ گرانمایہ سرمایہ، جو ہمارے فقہی سلسلہ کا ایک فخر لائق ورثہ تھا، ہاتھ نہیں آیا، اللہ جانے محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ ڈر ہے کہ اس ان مول بیش بہا یادگار کو، فضول و ناکارہ کاغذات سمجھ کر، ضائع نہ کر دیا ہو۔

حضرت کے فتاویٰ کے وہ مرتب مجموعے یا متفرق سرمایہ، جو مفقود و نا معلوم ہے

اوپر حضرت کے فتاویٰ کے، جن مجموعوں یا متفرق فتاویٰ کا تذکرہ ہوا ہے اور آئندہ مطبوعہ فتاویٰ کا جو ذکر آئے گا، وہ حضرت کے کل فتاویٰ نہیں ہو سکتے۔ یقیناً حضرت مولانا کے فتاویٰ کا ایک بڑا، شاید بہت بڑا ذخیرہ تھا، جو ہماری متواتر بے حسی

(۱) حضرت حاجی صاحب سے منسوب رسالہ فیصلہ ہفت مسئلہ، پہلی مرتبہ مطبع نظامی کانپور سے چھپا تھا، اس طباعت کا نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

اور مسلسل بے توجہی کی نذر ہوگیا۔ مجھے ایسے چند مجموعوں اور کثیر فتاویٰ کا پتہ ہے، جواب دستیاب و دریافت نہیں، تاہم یہاں ان کا اس لئے تذکرہ کیا جارہا ہے، کہ اول تو اس سے حضرت کے فقہ وفتاویٰ کی وسعت کا علم ہوتا ہے، دوسرے ممکن ہے ان اشارات کی مدد سے یا کسی اور کو، آئندہ کسی وقت ان کی دریافت وجستجو میں کامیابی ہوجائے۔

(۱) مجموعہ حضرت مولانا محمد یحیٰی کاندھلوی کا جمع اور مرتب کیا ہوا تھا: مفقود مجموعوں میں غالباً سب سے اہم اور جامع ترین، مجموعہ فتاویٰ وہ ہوگا، جس کی اشاعت کا مولانا محمد یحیٰی کاندھلوی نے اعلان کیا تھا، اسکا اشتہار بھی دیدیا تھا، مگر وہ مجموعہ چھپا نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا۔ [اس کا مزید کچھ تذکرہ آئندہ سطور میں آرہا ہے]

(۲) فخر المتاخرین، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے حل مطالب حدیث کے لئے، حضرت مولانا گنگوہی سے سوالات اور ان کے جوابات دوسرا مجموعہ جو بظاہر بہت بڑا تو نہیں ہوگا، لیکن معنوی طور پر یقیناً بڑے مجموعوں سے بھی بڑھ کر ہی ہوگا۔ یہ فہم حدیث کا بے بہا ورثہ اور ایسا گراں قدر خزانہ تھا، جس کے برصغیر ہند کی علمی تاریخ میں، بہت کم نمونے موجود ہوں گے۔ یہ وہ مراسلت اور علمی استفسارات تھے، جو علامۂ زمن فخر المتاخرین، حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے، بعض احادیث کے مطالب کی، وضاحت وتفہیم کے لئے، حضرت مولانا گنگوہی سے کئے تھے اور حضرت مولانا نے ان کے جوابات تحریر فرمائے تھے۔ ذرا غور تو فرمائیے، وہ سوالات کیسے لاینحل اور دقیق ہوں گے، جو ایسے محقق امام نے دریافت کئے ہوں گے اور کیا ہی وہ حل مطالب اور جوابات ہوں گے، جو حضرت مولانا گنگوہی نے ان کی تحقیق ووضاحت میں رقم فرمائے ہوں گے۔ اس مراسلت ومکتوبات کا، حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا فرنگی محلی کے ایک مشترک شاگرد، مولانا حکیم نعمت اللہ نے تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی نے، حضرت مولانا استاذی گنگوہی سے محض مطالب حدیث کے متعلق استفسار فرمایا تھا، یہ خطوط اس وقت محفوظ تھے، القاب میں بزرگانہ الفاظ تھے" (۱)

(۳) حکیم الامت تھانوی کے حضرت مولانا سے سوالات وجوابات اور تھانوی کے ذخیرہ میں محفوظ، حضرت گنگوہی کی چند اہم تحریریں وافادات تیسرا اہم ذخیرہ، وہ علمی تحریریں اور فتاویٰ تھے، جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے، حضرت مولانا سے دریافت کئے تھے، اور ان کے علاوہ بھی، حضرت مولانا تھانوی کے پاس حضرت کی جو اہم تحریریں اور نادر علمی افادات تھے، وہ سب حضرت مولانا تھانوی نے، مولانا محمد یحیٰی کو دیدیئے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی نے لکھا ہے:

(۱) رسالہ صدق الیقین بحواب هو الحق الیقین۔ تالیف مولانا حکیم نعمت اللہ صاحب [مقیم خانقاہ مانک مئو ضلع پرتاب گڈھ یوپی] مشمولہ ارواح ثلاثہ، مرتبہ مولانا ظہور الحسن کسولوی ص: ۳۲۸، [سہارنپور، بلا سنہ]

''حضرت قدس سرہ کی بعض تحریر عام اور خاص مضامین کی بھی، میرے پاس تھیں، جو میں نے مکرمی مولانا محمد یحییٰ صاحب کو دیدی تھیں۔ جن میں بعض خاص دست مبارک کی لکھی ہوئی ہیں اور بعض، بعد معذوری بصر کے، دیگر خواص معتقدین سے لکھوائی ہوئی ہیں۔(۱)

(۴) حضرت مولانا کے گھر پر موجود تحریرات و مکتوبات وغیرہ، جو مولانا حکیم مسعود احمد اور مولانا حکیم عبدالرشید محمود ننھو میاں گنگوہی نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کو دیدیئے تھے۔

حضرت کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعود احمد اور ان کے فرزند مولانا حکیم عبدالرشید محمود [ننھو میاں] حضرت مولانا گنگوہی کی متعدد اہم علمی باقیات، یادداشتیں، تحریریں وغیرہ، وقتاً فوقتاً مولانا محمد یحییٰ صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کو عنایت فرماتے رہے، اس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، یہاں تک کہ وہ سند [اجازت حدیث] بھی، جو حضرت شاہ عبدالغنی مجددی نے، حضرت مولانا گنگوہی کو مرحمت فرمائی تھی، مولانا حکیم ننھو میاں صاحب نے، حضرت شیخ کو دیدی تھی۔ جب ایک مرتبہ راقم نے حضرت شیخ کی ہدایت پر، حضرت کے کتب خانہ کو صاف اور مرتب کیا تھا، اس وقت وہ سند سامنے آئی تھی، ہلکے آسمانی رنگ کاغذ پر لکھی ہوئی ایک لفافہ میں رکھی تھی، اس کے ساتھ ہی شیخ کی یادداشت بھی رکھی ہوئی تھی، کہ یہ سند حکیم ننھو میاں صاحب نے دی ہے۔

مگر نہایت حیرت ہے کہ اس وقت حضرت شیخ کے ذخیرہ میں، ان میں سے کوئی بھی تحریر، مکتوبات یا فتوے موجود نہیں، یہاں تک کہ حضرت شاہ عبدالغنی کی وہ سند بھی نہیں ملی۔ راقم نے برادرم، مولانا محمد شاہد صاحب سہارنپوری سے جو حضرت شیخ کے کتب خانہ کے نگراں ہیں، مکرر دریافت کیا، انہوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا اور افسوس کے ساتھ اطلاع دی، کہ اس وقت حضرت مولانا گنگوہی کی کوئی تحریر یادداشت، فتویٰ یا وہ سند، اس ذخیرہ میں موجود نہیں ہے، فاناللہ و انا الیہ راجعون.

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سرمایہ کیا ہوا، کہاں گیا، یہ تو خیال بھی نہیں ہوسکتا کہ حضرت مولانا محمد یحییٰ یا حضرت شیخ الحدیث نے ایسے گرانمایہ افادات و فتاویٰ [جن کی کوئی اور نقل، موجود نہیں] کی طرف سے بے توجہی برتی ہو اور یونہی کسی کو دیدیئے ہوں، یہ بھی ممکن نہیں کہ حضرت شیخ کے کتب خانہ سے یہ سب چیزیں کسی نے اڑالی ہوں، صاف کردی ہوں، پھر کیا ہوا، اللہ ہی جانے؟؟؟

جب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے اپنی آپ بیتی تحریر فرمائی تھی، اس وقت اس میں درج بعض اطلاعات و معلومات کی تکمیل کے لئے، حضرت کے مسودات اور نادر کاغذات کی المماری کا، حضرت الاستاذ، حضرت مولانا

(۱) یادیاراں [درتذکرہ حضرت مولانا گنگوہی] تالیف حضرت مولانا تھانوی ص:۱۳ [کتب خانہ یحیوی سہارنپور۔ ۱۳۴۵ھ] نیز ص:۱۸ [مطبوعہ تالیفات اشرفیہ، تھانہ بھون۔ بلاسنہ]

محمد یونس جونپوری اور استاذی حضرت مولانا محمد عاقل صاحب مدظلہما نے تفصیل سے جائزہ لیا تھا، اگر اس میں حضرت مولانا گنگوہی کی کچھ تحریریں یا افادات ہوتے، تو اس وقت سامنے آجاتے مگر اس وقت بھی اس کا کچھ تذکرہ نہیں آیا، اور یہ حضرات مخدومین بھی، اس ذخیرہ سے ناآشنا ہی رہے۔

(۵) حضرت کے بقلم خود نوشتہ فتاویٰ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ، بجواب سوالات مولوی نظیر حسین، آبھوی:

حضرت مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کے سب سے مرتب مجموعوں میں سے اہم ترین مجموعہ تو غالباً وہی ہوگا، جو مولانا محمد یحییٰ صاحب نے مرتب کیا تھا، لیکن حضرت کے معلوم فتاویٰ کے جوابات یا ذخیرہ میں، سب سے بڑا، اور کثیر فتاویٰ پر مشتمل وہ خزانہ تھا، جو تمام تر خود حضرت مولانا کے قلم سے یعنی خودنوشت تھا۔ یہ خزانہ بے بہا اندازاً تقریباً تین سو سے زائد کاپیوں یا مفصل اجزاء پر مشتمل تھا، جو ہماری اپنی غفلت اور بے اعتنائی سے ضائع ہو چکا ہے، تاہم یہاں اس کے پس منظر اور سبب تحریر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کے متوسلین میں، گنگوہ کی قریبی بستی آبھہ [ضلع سہارنپور] کے ایک شخص، مولوی نظیر حسین صاحب تھے، [وفات: ۲۳ شوال ۱۳۳۲ھ/۱۴ ستمبر ۱۹۱۴ء] جو حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کے علاوہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی نہایت گہرا تعلق رکھتے تھے اور حضرت گنگوہی سے تو ایسا رابطہ، ایسے مراسم اور قربت تھی کہ باید وشاید! حضرت مولانا کو بھی ان سے غیر معمولی انسیت تھی، گھر کا سا معاملہ فرماتے تھے، حضرت مولانا کثرت سے ان کے یہاں آتے جاتے تھے، شدت تعلق اور روابط کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ حضرت مولانا عید کے دن بطور خاص سفر کر کے، ان کے گھر جایا کرتے تھے، اور ان کو اپنے خاص عزیزوں اور گھر کے افراد کی طرح رکھتے تھے۔ اور خود ان کا بھی یہی حال تھا کہ وہ اپنی زمینداری اور ہر طرح کی پیداوار اور سامان میں، حضرت کا، حضرت کی اہلیہ محترمہ کا اور حضرت کے سب بچوں کا، اسی طرح، پورا پورا حصہ لگاتے تھے، جس طرح اپنا اور اپنی اولاد کا۔(۱)

مولوی نظیر حسین حضرت سے بہت بے تکلف تھے اور حضرت سے کثرت سے فقہی سوالات کیا کرتے تھے، بعض موقعوں پر، حضرت کی کسی مصروفیت کی وجہ سے، ان کے سوالات کی بات رہ جاتی اور جوابات نہ ملتے، تو ان کو شکایت ہوتی اور حضرت کو بھی خیال ہوتا تھا، اس لئے حضرت مولانا نے ان سے فرما دیا تھا، میاں! تم اپنے تمام سوالات کاغذ پر یا ایک کاپی میں لکھ کر لے آیا کرو، میں اسی پر ان کے جوابات لکھ دیا کروں گا۔

حافظ نظیر حسین صاحب نے فوراً ہی اس پر عمل شروع کر دیا، ان کا ہفتہ میں ایک مرتبہ، جمعرات [پنجشنبہ] کو گنگوہ آنے

(۱) مولوی نظیر حسین صاحب کے حضرت مولانا گنگوہی سے عقیدت ومودت کا تذکرۃ الرشید نیز حضرت مولانا تھانوی کے مواعظ اور ملفوظات میں بیسوں جگہ ذکر آیا ہے۔

اور جمعہ یا شنبہ کو واپس جانے کا معمول تھا، جب جمعرات کو آتے تو ایک کاپی ساتھ لاتے، جس میں ان کے سوالات درج ہوتے تھے، یہ سوال کبھی بھی سو سے کم نہیں ہوتے تھے، زائد کی کوئی حد اور پابندی نہیں تھی، کبھی کبھی ڈھائی سو سے ساڑھے تین سو تک بھی ہو جاتے تھے، مگر حضرت نہایت خوش دلی اور بشاشت قلب سے اس کاپی کو وصول کرتے، اور اسی انشراح اور پابندیٔ وقت کے ساتھ، ان کے جوابات تحریر فرماتے تھے۔ حضرت مولانا نے یہ معمول بنالیا تھا کہ جب خانصاحب آتے، ان سے سوالات کی نئی کاپی وصول فرمالیتے اور گذشتہ کاپی، جس پر مکمل جوابات لکھے ہوئے ہوتے تھے، ان کو دیدیا کرتے تھے، برسہابرس تک یہ معمول رہا۔ نظیر حسین صاحب کے پوتے [لئیق محمد خاں صاحب] نے راقم کو بتایا، کہ ان کاپیوں کا ایک بڑا حصہ تو چوری کے ایک حادثہ میں، گھر سے غائب اور ضائع ہو گیا تھا، لکڑی کا وہ صندوق جس میں حضرت کے جوابات اور تحریرات کا بڑا حصہ رکھا ہوا تھا، چوری میں چلا گیا تھا، پھر اس کا پتہ نہیں ملا، لیکن تقریباً سوا سو کاپیاں، جو تمام حضرت کے قلم سے لکھی ہوئی تھیں، اس صندوق کے علاوہ ہمارے یہاں موجود تھیں، ان تقریبا سو کاپیوں یا اس گنج گرانمایہ پر [جس کی اب کسی طرح بھی تلافی اور اس کا مثل ممکن نہیں] کیا گزری، اس کی روداد تقریباً اُن ہی صاحب کے الفاظ میں نقل کر رہا ہوں۔

فاعتبروا یااولی الابصار.

لئیق محمد خان صاحب کہتے تھے کہ مجھے یہ خیال آیا کہ یہ کاپیاں حضرت کے مبارک قلم کی لکھی ہوئی ہیں، بہت بڑی یادگار اور تبرک ہیں اور میری ایسی لیاقت وصلاحیت نہیں کہ میں ان کو پڑھ کر، ان سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کر سکوں، اس لئے میں نے یہ سوچ کر کہ ان سے بہت زیادہ دینی فائدہ ہوگا، اور بہت دنوں تک حفاظت سے رکھی رہیں گی، ان کو ایک بڑے دینی ادارہ میں دیدینے، جمع کرانے کا فیصلہ کرلیا اور ان تمام، تقریباً سوا سو کاپیوں کو [جس میں سے ہر ایک میں ایک سو سے تقریباً ساڑھے تین سو تک سوالات کے جوابات، حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے تھے] ایک کپڑے میں گٹھری سی باندھ کر، فلاں ادارہ (۱) میں خود لے کر گیا، فلاں صاحب کی خدمت میں پہنچا، تمام بات عرض کی اور کہا کہ اس گٹھری میں، حضرت مولانا گنگوہی کے خودنوشت فتاویٰ اور تحریریں ہیں، آپ ان کو یہاں محفوظ کر لیجئے، انہوں نے اس سرمایہ کو ایک نظر دیکھا اور فرمایا کہ بھائی! ان پھٹے پرانے اوراق کی، یہاں کون حفاظت کرے گا، کون ان کو پڑھے گا، یہ ہمارے کام کے نہیں ہیں، تم ان کو لے جاؤ۔

خان صاحب اس بات سے نہایت مایوس اور آزردہ ہوئے اور یہ سوچ کر کہ فلاں صاحب کے پاس چلوں، وہ کچھ کوشش کریں گے اور ذمہ داروں کو توجہ دلائیں گے، تو یہ ذخیرہ یہاں جمع کرلیا جائے گا، محفوظ ہو جائے گا مگر وہاں پہنچے تو بات

(۱) انہوں نے متعلقہ ادارہ اور اصحاب کے نام صاف صاف بتائے تھے، بلکہ لکھوادیئے تھے، مگر اس سے بعض اصحاب کو ٹھیس پہنچے گی اذیت ہوگی، اور وہ اس کو شاید الزام خیال فرمائیں، اس لئے متعلقہ حضرات کے نام نہیں لکھے گئے۔

اور خراب ہوئی۔ ان صاحب نے جو خیر سے بڑے مشہور مدرس تھے، خانصاحب کی بات سنتے ہی بے ساختہ کہا: اس کباڑ کو میرے سامنے مت کھولو، مجھے نزلہ ہوجائے گا، اس کو یہاں سے اٹھالو، لیجاؤ، خانصاحب کو اس سے نہایت تکلیف ہوئی، اور ان سے دریافت کیا کہ کہاں لیجاؤں، کیا کروں، ان صاحب نے جو کچھ کہا کاش! کاش وہ اس میں تأمل کرتے، کوئی اچھا مشورہ دیتے، انہوں نے کہا اس کی فکر کرنی بے سود ہے، اس کا کچھ نہیں ہوسکتا، کوئی فائدہ نہیں، اب اس کا کوئی پڑھنے والا نہیں، کون اس میں سر کھپائے گا، تم اس گٹھری کو لیجاؤ، گاؤں کے کنویں میں پھینک دو۔ **الاسف فالاسف!**

خان صاحب اس بات سے ایسے شکستہ خاطر ہوئے، ان کو اس قدر رنج ہوا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، کہ ہم تو اس کو کیسا علمی خزانہ اور حضرت کی بڑی یادگار سمجھے ہوئے تھے، یہ تو کچھ بھی نہیں نکلا، اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، کوئی بھی اس پر توجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ اسی غم اور افسردگی کی کیفیت میں اپنے گاؤں پہنچے اور اس پوٹلی کو جو علم کا خزانہ اور فقہ حنفی کا نادر الوجود انمول ذخیرہ تھی، گاؤں کے ایک کنویں میں پھینک دیا۔

ہائے، ہائے! کیسے افسوس کی بات ہے، کیا کہا جائے، اگر وہ دونوں صاحبان ایک دو لفظ، ان کی ہمت افزائی کہہ دیتے اور اس ذخیرہ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ فرمالیتے، تو یہ بیش بہا نعمت کم سے کم یوں ضائع نہ ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کاپیوں کو پڑھ کر، صاف کر کے مرتب کرلیا جاتا، تو بارہ، چودہ جلدوں پر مشتمل، شاید پندرہ سولہ ہزار سوالات کے جوابات، آج ہماری رہنمائی کررہے ہوتے، مگر: یک حرف، کاشکے است کہ صد جا نوشتہ ایم۔

بعد میں جب میں نے [لئیق محمد] خانصاحب سے ان فتاویٰ کے متعلق دریافت کیا اور ان کو باقی ماندہ، موجود حصہ عنایت فرمانے کی درخواست کی، تو افسوس کا اظہار کرتے رہے، بار بار کہتے تھے کہ اگر تمہارے جیسا کوئی آدمی اس وقت مل جاتا، تو ہمارے دادا کی زندگی بھر کی محنت اور حضرت کی ایک بڑی یادگار یوں برباد نہ جاتی۔

(۶) کاندھلہ اور نواح میں چند فتاویٰ ان کے علاوہ خود میرے وطن کاندھلہ اور نواح میں بھی، کئی لوگوں کے پاس، حضرت کے ایک ایک دو فتوے موجود تھے، میں نے ہر چند کوشش کی مگر متعلقہ اصحاب نے ان کے عکس فوٹو اسٹیٹ دینے سے صاف منع کردیا اور مجھے امید نہیں کہ یہ فتاویٰ اور تحریرات عرصہ تک محفوظ رہیں گے، یا شائع ہو کر افادہ عام کا ذریعہ بنیں گے۔

(۷) میرے خاندان کے اکابر کے نام ایک اور ہم سرمایہ وہ خطوط و فتاویٰ تھے، جو خود ہمارے خاندان میں **چند اہم ترین خطوط اور مفصل تحریرات:** موجود تھے۔ یہاں یہ عرض کردینا چاہئے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے اجداد کے کاندھلہ کے خاندان سے، کئی نسلوں سے گہرے روابط اور مراسم چلے آرہے تھے، حضرت مولانا، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے خاص نیاز مند اور مولانا کے خلیفہ و جانشین، مولانا محمد اسماعیل جھنجھانوی کاندھلوی کے قدردان

تھے اور حضرت مولانا گنگوہی کی، اس خاندان کے اصحاب سے علمی روابط اور خط و کتابت رکھتے تھے۔

خصوصاً مولانا فیض الحسن محمد اکبر کاندھلوی اور مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان سے جماعت ثانیہ وغیرہ کے موضوع پر، طویل مراسلت ہوئی تھی، ان دونوں کے خطوط اور حضرت مولانا گنگوہی کے بقلم خود نوشتہ مفصل و مدلل جوابات میں نے دیکھے ہیں۔ ان میں سے حضرت کا ایک خط ایسا بھی تھا کہ، میں نے حضرت کے قلم سے اس قدر طویل خط یا تحریر، آج تک نہیں دیکھی۔ یہ خط فل سکیپ [A/4] پیمائش کے کئی کاغذ، ایک دوسرے سے جوڑ کر، چپکا کر، لمبی دستاویز کی طرح لکھا گیا تھا، جو کاغذ کی ایک ہی سمت پر تحریر تھا، دوسرا صفحہ یا پشت سادہ تھی۔ یہ تحریر دستیاب اور شائع ہوتی تو، حضرت کی تالیفات کی فہرست میں ایک اضافہ شمار کیا جاتا۔ مگر......

(۸) اور بھی چند تحریرات اور بھی میرے علم میں ہیں مگر وہاں میری رسائی نہیں اور جب تک رسائی کے ساتھ رونمائی نہ ہو، رسائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہر حال ایک ناتواں، بے کس، بے علم، لغزیدہ قدم، لغزیدہ قلم طالب علم کا جستجو کا سفر جاری ہے جو انشاء اللہ جاری رہے گا۔ وللہ الامر من قبل و من بعد:

یابم اورا، یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید، آرزوئے می کنم

حضرت مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کی طباعت واشاعت

(الف:) نسخہ مرتبہ مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کی اشاعت کا اعلان حضرت مولانا کے مجموعۂ فتاویٰ کی طباعت کا، غالباً سب سے پہلے، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے ارادہ کیا تھا، حضرت کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ فتاویٰ بھی فراہم اور مرتب کر لیا تھا اور اس اشاعت کا اعلان کر دیا تھا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے، حضرت مولانا گنگوہی کی ایک تصنیف: ''ھدایة المعتدی فی قراۃ المقتدی'' کئی مرتبہ شائع کی، اس کی ایک طباعت [جو غالباً اس کتاب کی پہلی اشاعت ہے اور] حضرت مولانا گنگوہی کی حیات میں چھپی تھی، اس کے دوسرے صفحہ پر ''حضرت مولانا مولوی رشید احمد گنگوہی کی اور تصانیف'' کے عنوان سے، حضرت مولانا کی، دستیاب مطبوعہ کتابوں کا ایک مکمل صفحہ پر اشتہار ہے، جس میں اور کتابوں کے علاوہ، ایک نام فتاویٰ رشیدیہ کا بھی ہے۔ لکھا ہے:

''فتاویٰ رشیدیہ: عرصہ سے اس ناکارہ کو، اس امر کی تلاش ہے، کہ جس کسی کے پاس حضرت مولانا کے مسائل و فتاویٰ فراہم ہوں، ان کی نقل لیکر، ایک مجموعہ چھپوا دیا جائے اور بہت سا ذخیرہ فراہم ہو بھی گیا ہے۔

جن اقوال مؤدب [کذا؟] کے پاس کچھ مسائل موجود ہوں، وہ ضرور ارسال فرماویں اور یہ مجموعہ انشاء اللہ تعالیٰ جلد تیار ہونے والا ہے۔

مگر افسوس کہ ہدایۃ المعتدی کی اس طباعت پر، سنہ طباعت وغیرہ موجود نہیں، اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مجموعہ کس سن میں چھپا تھا، تاہم یہ طے ہے کہ اس کی طباعت، حضرت مولانا گنگوہی کی حیات میں [وفات: ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء] ہوئی تھی۔ سرورق کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"مقبول بارگاہ صمد، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی مدظلہ العالی۔ حسب استدعاء بندۂ نحیف محمد یحییٰ کاندھلوی وطناً، گنگوہی اقامتاً، در مطبع بلالی ساڈھورہ، باہتمام منشی محمد بلال کریم بخش طبع گردید"

مگر اس اشتہار و اعلان کے باوجود، اس کی طباعت کا موقع نہیں آیا اور وہ نسخہ بھی مفقود اور بے نام و نشان ہے۔

(ب:) فتاویٰ رشیدیہ مرتبہ مولانا عزیز الدین مراد آبادی: مولانا محمد یحییٰ صاحب کے مرتبہ نسخہ کے بعد، جو نسخہ سب سے پہلے شائع ہوا، وہ مولوی عزیز الدین صاحب مراد آبادی کا مرتبہ نسخہ ہے، جس کی ترتیب و طباعت کا عمل، حضرت مولانا گنگوہی کی حیات [وفات: ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء] میں شروع ہو گیا تھا، اس نسخہ کا پہلا حصہ، حضرت مولانا کی حیات میں اشاعت کے لئے تیار ہو گیا تھا، بعد میں مختصر وقفوں سے دو اور حصوں کی اشاعت ہوئی۔

فتاویٰ رشیدیہ کا یہی وہ واحد نسخہ ہے، جو حضرت مولانا کے فتاویٰ کے حوالہ سے معروف ہے، مگر اس نسخہ کی تاریخ ترتیب و تالیف، اس کی سب سے پہلی اشاعت، نیز مصنف کی شائع کی ہوئی، دوسری تیسری طباعت ان کے علاوہ ممتاز علماء کی نگرانی میں چھپے ہوئے، قابل قدر نسخوں کا تعارف اور نسخہ مرتبہ مولانا عزیز الدین کی نسبت، بعض شبہات کا جائزہ اور متعلقہ پہلوؤں پر نظر، وضاحت و تفصیل کی طالب ہے، لیکن اس تعارف و تذکرہ سے پہلے، اس مجموعۂ فتاویٰ کے جامع و مرتب اور پہلے ناشر، مولانا عزیز الدین صاحب مراد آبادی کے، کچھ احوال انکے حضرت مولانا گنگوہی سے، روابط و ارادت کی کچھ تفصیل اور عزیز الدین صاحب کے، علمی تصنیفی آثار اور دینی خدمات کا کسی قدر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔

احوال مولانا عزیز الدین مراد آبادی، جامع و مؤلف فتاویٰ رشیدیہ

مولوی حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی کا صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں۔ اکمل البیان کی تمہید میں، مولانا محمد اسماعیل گودھروی اور مولانا عبدالغفار صاحب بستوی نے، مولانا عزیز الدین کا سن پیدائش ۱۲۹۵ھ [۱۸۷۸ء] لکھا ہے، (۱) جو

(۱) تمہید اکمل البیان [فی تائید تقویۃ الایمان] ص:۲۹ [طبع اول، مکتبہ سلفیہ۔ لاہور۔ بلا سنہ]

درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ مولانا عزیزالدین صاحب نے، حضرت مولانا گنگوہی سے جو سوالات کئے اور حضرت نے ان کے جوابات عنایت فرمائے، وہ سب موقع بموقع فتاویٰ رشیدیہ میں درج ہیں، ان میں سب سے پہلا سوال ۱۳۰۰ھ کا مرقومہ ومکتوبہ ہے، جو اکمل البیان میں درج تاریخ ولادت کے پیش نظر ممکن ہی نہیں۔ مولانا عزیزالدین نے بھی اپنے خودنوشت حالات میں اپنا سنہ ولادت ذکر نہیں کیا، جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اکمل البیان کی تمہید میں درج، مذکورہ سنہ ولادت قیاسی ہے، جو درست نہیں۔

مدرسہ شاہی اور مدرسہ امدادیہ میں حفظ قرآن اور تعلیم: مولوی عزیزالدین صاحب کے اہل خاندان کا، چاندی کے برتنوں کا کاروبار تھا، اس وجہ سے حافظ صاحب کا گھرانہ چاندی والا مشہور تھا۔ مولانا عزیزالدین نے مدرسہ شاہی اور امدادیہ مرادآباد میں قرآن مجید حفظ کیا، انہی مدارس میں عربی فارسی کی درسیات پڑھیں مگر کیا کیا کتابیں کن استادوں سے پڑھیں اور کل سرمایہ تعلیم کیا تھا، معلوم نہیں۔ استادوں میں مولانا گل محمد خاں پشاوری، مشہور عالم تھے۔

حضرت مولانا گنگوہی سے نہایت عقیدت وانسیت تھی، برسوں تک متواتر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ حضرت مولانا کے زمانہ وفات تک حضرت سے خط وکتابت اور دینی علمی فقہی استفادہ کا سلسلہ جاری تھا، اور بھی کئی علماء سے روابط اور محبت ومودت کی نسبت تھی اور ان سے خط وکتابت بھی رہتی تھی۔

علمی تصنیفی ذوق اور تصانیف ومؤلفات مولوی عزیزالدین صاحب، دینی خدمات میں مشغول رہتے تھے، تحریر وتالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے، مختلف دینی فقہی موضوعات پر، مولانا عزیزالدین کے مرتبہ ومکتوبہ سے متعدد کتابچے اور اشتہارات وغیرہ وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے تھے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ وہ عمدہ علمی خدمات وتصانیف ہیں، جن کی وجہ سے ان کا نام زندہ ہے اور رہے گا۔ مولوی عزیزالدین صاحب کی تصانیف میں سے صرف تین کتابیں چھپی ہیں اور کتابوں کے چھپنے کا موقع نہیں آیا۔ مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) مطرق الحدید علی صاحب التحقیق الجدید

(۲) اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان [بجواب اطیب البیان]

(۳) فتاویٰ رشیدیہ

مطرق الحدید علی صاحب تصانیف الشہید: مولانا حکیم عبدالشکور مرزاپوری نے، جو دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے مگر مختلف دینی علمی اختلافی مباحث میں علمائے دیوبند سے مختلف رائے رکھتے تھے اور سب سے الگ خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ان کی تالیفات میں سے ایک کتاب: "التحقیق الجدید علی تصانیف الشہید" بھی ہے، جو [

جنوری ۱۹۳۱ء شعبان ۱۳۴۹ھ] کی تالیف ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع مجیدی کانپور سے چھپی تھی، اس نسخہ پر سنہ طباعت درج نہیں مگر اندازہ یہ ہے کہ تصنیف کے بعد جلد ہی چھپ گئی تھی۔ اس کتاب میں مرزا پوری صاحب نے، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی بعض تصانیف کے شاہ صاحب سے انتساب پر شک ظاہر کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ خصوصاً تقوية الايمان، ايضاح الحق الصريح فى احكام الميت و الضريح اور تنوير العينين فى رفع اليدين شاہ صاحب کی تحریر وتصنیف نہیں ہیں۔ اگر یہ شاہ صاحب کی ہیں، تو ان میں کثیر تحریفات وترمیمات ہوئی ہیں۔ مگر حکیم مرزاپوری کی یہ رائے بالکل غلط، خلاف تحقیق اور نا قابل قبول تھی، اس لئے مولوی عزیزالدین صاحب نے، اس کا جامع علمی جواب مطرق الحديد على صاحب التحقيق الجديد کے نام سے لکھا، جو ادارہ، اخبار محمدی دہلی کے زیر اہتمام، جید برقی پریس دہلی سے، جمادی الاخریٰ ۱۳۵۱ھ [اکتوبر ۱۹۳۲ء] میں چھپا تھا، یہ تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔

اکمل البیان: حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کی مشہور زمانہ بابرکت تالیف تقویۃ الایمان، پر کئے گئے جملہ اعتراضات، خصوصاً مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی کی کتاب، اطیب البیان کا مفصل علمی جائزہ اور محققانہ جواب ہے۔

مشہور عالم مناظر اور مصنف مولانا ثناء اللہ امرتسری نے، اطیب البیان کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مولوی عزیزالدین صاحب کی خواہش پر، یہ کام ان کے سپرد کر دیا اور اس کو اپنے اخبار اہل حدیث امرتسر میں چھاپنے کی ذمہ داری لی۔ مولوی عزیزالدین صاحب نے، جو اس موضوع سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اس پر ان کا وسیع مطالعہ تھا، فوراً ہی لکھنا شروع کر دیا، جس قدر لکھا جاتا ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر میں چھپنے کے لئے، مولانا ثناء اللہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جاتا تھا ہفت روزہ اہل حدیث کی اشاعت مورخہ ۱۸/ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ۔ [۱۴/ اپریل ۱۹۳۳ء جلد: ۳۰ شمارہ: ۲۴] سے اکمل البیان کی قسط وار اشاعت شروع ہوئی اور اگرچہ جناب مصنف نے اپنی کتاب، ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ [فروری، مارچ ۱۹۳۷ء] میں مکمل کر لی تھی مگر اخبار اہل حدیث امرتسر میں اس کی مکمل اشاعت نہ ہو سکی تھی، کہ ۱۹۴۷ء کے خوں چکاں آتش فشاں حوادث پیش آ گئے، جس میں مولانا ثناء اللہ صاحب کا ادارہ، کتب خانہ، پریس، مکان دوکان، سب جلا کر خاک کر دیئے گئے، مولانا کے اکلوتے صاحبزادے شہید کر دیئے گئے تھے اور مولانا ثناء اللہ صاحب صرف بدن کے دو کپڑوں کے ساتھ، نہایت بے کسی کے عالم میں، امرتسر چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اس لئے اکمل البیان کی طباعت بھی قصہ پارینہ اور خواب وخیال ہو کر رہ گئی تھی، مگر پاکستان کے ممتاز اہل حدیث عالم، مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب بھوجیانی کو اس کتاب سے تعلق تھا، اور وہ اس کے مکمل نسخہ [مسودۂ مؤلف] کی تلاش میں لگے رہے، بالآخر جوئندہ یابندہ کے مصداق، اس کا مکمل مسودہ، جو آٹھ سو سے صفحات پر مشتمل تھا مراد آباد سے مولوی عزیزالدین صاحب کے ذاتی کتب خانہ سے، ان کے ورثاء کے ذریعہ مل گیا، جس پر مولانا حنیف

صاحب بھوجیانی نے مکمل نظر ثانی کی، اس کے حوالے وغیرہ تلاش کئے، اور اس کو اپنے موقر علمی ادارہ، الدار السلفیہ، لاہور سے احسن طریقہ پر شائع کردیا۔ سنہ طباعت درج نہیں، بکل آٹھ سو پچاسی صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب مولوی عزیز الدین صاحب کی ایک بڑی علمی یادگار ہے، ضرورت ہے کہ اس کے مباحث کو مزید تحقیق وتوضیح کے ساتھ، علیحدہ علیحدہ حصوں میں شائع کیا جائے تقریباً نو سو صفحات کی کتاب کا، جس پر تفصیلی فہرست بھی شامل نہیں، مطالعہ اور اس سے بہتر استفادہ آسان نہیں ہے۔ فتاویٰ رشیدیہ کا مفصل تعارف آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔

مولانا عزیز الدین صاحب کے حضرت مولانا گنگوہی سے روابط، عقیدت وارادت: افسوس ہے کہ مولانا عزیز الدین صاحب کی حضرت مولانا گنگوہی سے واقفیت کی ابتداء، ارادت اور روابط کی تفصیلات دریافت نہیں۔ مولانا کے مرتبہ مجموعہ فتاویٰ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی، حضرت مولانا سے طویل وقدیم وابستگی تھی، جو تقریباً پچیس سال تک، اسی طرح قائم رہی۔ بہ ظاہر اس کی ابتداء ۱۳۰۰ھ سے پہلے ہوچکی تھی، مولانا عزیز الدین صاحب نے فتاویٰ رشیدیہ کے تینوں حصوں میں، حضرت کے وہ تمام فتاویٰ اور اپنے سوالات درج کئے ہیں، ان تحریرات میں سے جن فتاویٰ پر سنہ تحریر ہے، ان سب سے پرانا سوال سنہ ۱۳۰۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس میں مولانا عزیز الدین صاحب نے، حضرت مولانا سے اس صدی کے مجدد کے متعلق دریافت کیا ہے اس سوال میں ۱۳۰۰ھ میں صاف لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے (۱) کہ مولانا کا حضرت مولانا سے ۱۳۰۰ھ سے برابر رابطہ اور خط وکتابت تھی اور مولانا کے دل اور نگاہ میں، حضرت مولانا کا کیا مقام ومرتبہ تھا، اس کا خود مولانا عزیز الدین صاحب کی ایک تحریر سے اندازہ ہورہا ہے۔ مولانا عزیز الدین نے اپنے خود نوشت حالات میں لکھا ہے:

> ”پھر حضرات علمائے دیوبند میں، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ سے حسن عقیدت رہی، آپ نے مسائل اہل حدیث کے مسلک کی تائیدات فرمائیں اور مولانا اشرف علی تھانوی سلمہ اللہ سے بھی حسن عقیدت ہے۔“ (۲)

مولانا عزیز الدین، حضرت کے کمالات، علوم اور روحانی مرتبہ کے دلدادہ وقدردان تھے، اس کا خود مولوی عزیز الدین

---

(۱) اس اندراج سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اکمل البیان کے آغاز پر مولانا محمد اسماعیل گودھروی اور مولانا عبد الغفار صاحب بستوی نے مولانا عزیز الدین کا جو سن ولادت ۱۳۹۵ھ نقل کیا ہے وہ بلاشبہ غلط ہے، اس حساب سے تو ۱۳۰۰ھ میں مولانا عزیز الدین صاحب کی عمر صرف پانچ سال ہوتی ہے، چوں کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ۱۳۰۰ھ کے بعد کے قریبی سنین کے اور بھی فتوے درج ہیں، اس لئے سنہ ۱۲۹۵ھ کا مولانا کا ولادت ہو، ممکن نہیں، ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۵ھ ہوسکتا ہے۔ فلیتحقق

(۲) تراجم علمائے حدیث ہند مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی ص: ۵۶۴ [طبع اول دہلی: ۱۳۵۶ھ۔ ۱۹۳۸ء]

صاحب کی اور تحریرات سے مزید علم ہو رہا ہے۔ حضرت کا ایک فتویٰ اپنے مرتبہ مجموعہ فتاویٰ میں نقل کرتے ہوئے، مولوی عزیزالدین صاحب حضرت کے کمالات، علوئے مقام اور اپنے احساسات وتعلق کا اظہار کرنے پر، جیسے مجبور ہو گئے، اس موقع پر مولوی صاحب کے قلم سے بے ساختہ یہ الفاظ ٹپک پڑے ہیں:

"ان تعقیبات کے جواب سے، ماشاء اللہ، سبحان اللہ، مولانا رأس المحدثین، اکمل الفقہاء والمحققین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب کے، تبحر علمی وتفقہ کا اہل علم ودانش اندازہ کر سکتے ہیں، کہ ان کے محققہ مسائل، کس طرح دلائل سے پُر ومالا مال ہیں، کیوں نہ ہو کہ مولانا ممدوح راسخ فی العلم والمعارف والحقائق ہیں، قدس اللہ سرہ (۱)

حضرت قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے تحقیق مسائل وفتاویٰ مولوی عزیزالدین حضرت مولانا گنگوہی سے انسیت وروابط کے علاوہ اور بھی متعدد بڑے علمائے احناف سے، قریبی ملاقات اور خط وکتابت رکھتے تھے، جس میں نامور عالم اور محدث مولانا عبدالرحمٰن انصاری پانی پتی اور حضرت مولانا تھانوی بطور خاص شامل تھے۔

مولوی عزیزالدین صاحب، حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی سے بھی رابطہ وعقیدت رکھتے تھے، سوالات ومسائل دریافت فرماتے رہتے تھے۔ محدث پانی پتی کا ایک والا نامہ، مولوی عزیزالدین صاحب نے، فتاویٰ رشیدیہ میں نقل کیا ہے اس خط میں جو اپنائیت ومحبت کا انداز ہے، اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ، مولانا عزیز الرحمٰن اور حضرت پانی پتی کے تعلقات قدیم اور خاصی خط وکتابت بھی تھی، محدث پانی پتی نے تحریر فرمایا ہے:

"میاں عزیزالدین سلمہ از عبدالرحمٰن عفی عنہ، بعد سلام مسنون، واضح ہو کہ میں بیماری متعلقین اور معالجہ چشم خود کی فکر میں چند ماہ سے تھا، اس وجہ سے خط وکتابت بند ہے، اب بھی میں پرہیز میں ہوں، جو مسئلہ سہل اور کم غور کا ہوتا ہے، اس کا جواب لکھتا ہوں، اور زائد خط وکتابت نہیں کر سکتا، کیونکہ حکیم صاحب کی طرف سے کام کرنے کی ممانعت ہے۔

تمہارے مسئلوں کا جواب یہ ہے، نماز پڑھنے میں گھنٹہ کا اعتبار نہیں، بعد زوال شمس سایہ اصلی چھوڑ کر، ایک مثل کے اندر جمعہ یا ظہر پڑھ لینی چاہئے۔ اور سوائے سایہ اصلی کے ایک مثل کے بعد، بروایت مفتی بہ وقت نماز عصر ہو جاتا ہے اور رجوع امام صاحب کا حال پھر پوچھنا۔ عصر کی نماز بعد ایک مثل کے ہو جاتی

(۱) فتاویٰ رشیدیہ حاشیہ ص:۹۲ حصہ دوم طبع اول [مراد آباد: ۱۳۲۴ھ] نیز ملاحظہ ہو: مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دہلی: ۱۳۵۲ھ۔ ص: ۱۱۶ حصہ دوم

ہے، اعادہ کی حاجت نہیں، ہم نے استادوں سے یہی سنا ہے کہ ہزارہ روزہ کی کچھ اصل نہیں اور سب نفل روزوں کی برابر ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

العبد عبدالرحمٰن بقلم عبدالسلام غفرلہ۔ نہم شعبان ۱۳۱۳ھ یوم شنبہ از پانی پت۔ عبدالسلام عفی عنہ کا سلام مسنون (۱)

حاجی امداد اللہ سے عقیدت و تعلق: فتاویٰ رشیدیہ کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عزیزالدین صاحب کی، حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی سے بھی ارادت تھی اور خط وکتابت رہتی تھی، شاید اسی تعلق اور حضرت مولانا کے ساتھ، حضرت حاجی صاحب سے ارادت کا اثر ہے کہ مولوی عزیزالدین صاحب نے، فتاویٰ رشیدیہ میں حضرت حاجی امداداللہ کا ایک مفصل مکتوب گرامی جو حضرت گنگوہی اور البراہین القاطعہ کے حوالہ سے، برپا ایک شورش کے جواب اور تردید میں، اپنا موقف ظاہر کرنے کے لئے حضرت حاجی صاحب نے تحریر فرمایا تھا، مولوی عزیزالدین صاحب نے فتاویٰ رشیدیہ میں شامل کیا ہے، حالاں کہ یہ مکتوب نہ کسی فقہی سوال کے جواب میں ہے، نہ ہی اس کا فتاویٰ رشیدیہ سے براہ راست کچھ تعلق ہے۔

حضرت مولانا تھانوی سے عقیدت اور مسائل میں رجوع حضرت مولانا گنگوہی کے بعد سب سے زیادہ عقیدت وانسیت حضرت مولانا تھانوی سے تھی جو حضرت مولانا گنگوہی کی وفات کے بعد بھی اسی طرح قائم واستوار رہی۔ حضرت مولانا تھانوی کے ملفوظات میں بھی، مولوی عزیزالدین صاحب کا ذکر آیا ہے، اور خود مولوی عزیزالدین صاحب نے اپنے خودنوشت حالات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"پھر حضرات علمائے دیوبند میں، مولانا رشید احمد رحمہم اللہ سے حسن عقیدت رہی، آپ نے مسائل اہل حدیث کے مسلک کی تائیدات فرمائیں اور مولانا اشرف علی تھانوی سلمہ اللہ سے بھی حسن عقیدت ہے" (۲)

فتاویٰ رشیدیہ میں بعض موقعوں پر تائید وتوثیق کے لئے حضرت مولانا تھانوی کے مجموعہ فتاویٰ [جس کی پہلی طباعت فتاویٰ اشرفیہ کے نام سے شائع ہو چکی تھی] کی عبارتیں نقل کی ہیں اور حوالے دیئے ہیں، اور جیسا کہ مولانا عزیزالدین نے لکھا بھی ہے کہ بعد میں مسلک اہل حدیث کی برملا تائید کرنے پر، حضرت مولانا تھانوی سے کچھ فاصلہ ہو گیا تھا لیکن عقیدت وانسیت برقرار رہی۔

دیگر علماء سے مراسلت اور تحقیق مسائل مولوی عزیزالدین صاحب کا تحقیق وجستجو کے ذوق کی وجہ سے،

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص:۴۳ حصہ اول [رحیمیہ دہلی: ۱۳۴۸ھ]

(۲) تراجم علمائے حدیث ہند ص:۱۶۳ [دہلی: ۱۳۵۶ھ]

ملک بھر کے ممتاز اہل علم وکمال سے رابطہ اور خط وکتابت رہتی تھی۔ مولوی عزیز الدین صاحب کے نام صادر اہل علم کے خطوط کا خاصا ذخیرہ تھا، جو تقریباً ۸۵-۱۳۸۴ھ [۶۶-۱۹۶۵ء] تک محفوظ تھا۔ مولوی صاحب کے مدرسہ کے ایک استاد و منتظم، مولانا عبدالغفار صاحب بستوی نے، مولوی عزیز الدین صاحب کی نسبت اپنی تحریر میں لکھا ہے:

”اہل علم سے مکاتبات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، چنانچہ ان کے نام لکھے ہوئے، اصحاب علم کے عربی واردو مکتوبات کا خاصا ذخیرہ، اب تک موجود ہے۔“

مرتب فتاویٰ رشیدیہ کا فقہی مسلک اگر چہ مرتب فتاویٰ رشیدیہ کو عموماً اہل حدیث اصحاب میں شمار کیا جاتا ہے، شاید اسی وجہ سے ہمارے علماء، ان کی اس بڑی دینی علمی خدمت [ترتیب فتاویٰ رشیدیہ اور اکمل البیان وغیرہ] کی طرف متوجہ نہیں ہوئے، مولانا عزیز الدین حضرت مولانا گنگوہی کی حیات تک برملا غیر مقلد نہیں تھے، اگر چہ مولانا میں تحقیق کا مزاج اور عمل بالحدیث کا خاص ذوق تھا مگر ظاہر ہے یہ فکر ومزاج نہ عیب ہے، نہ تقلید کے منافی۔ مولوی عزیز الدین صاحب نے ایک مرتبہ خود، حضرت مولانا گنگوہی کو اپنے فقہی مسلک اور نظریات کے متعلق صاف صاف لکھا تھا کہ:

”ہادی خلق رہنمائے بندہ، حضرت مولانا ومرشدنا، مولانا رشید احمد صاحب ادام اللہ فیوضکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ معروض فدویانہ آنکہ، حضور والا اقدس نے بندہ حقیر کی نسبت بجانب عدم تقلید تحریر فرمائی ہے، سو بندہ حقیر، تمام علماء ومقتدائے دین کو پیشوائے انام جانتا ہے اوران کے اتباع کو ذریعہ نجات ورستگاری آخرت تصور کرتا ہے۔ آمین! یہ صرف بعض لوگوں نے بوجہ اس کے، کہ خاندان حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی، مثل مولانا شہید علیہ الرحمۃ وغیرہ ہما کو، اپنا پیشوا ومقتدا وہادی برحق جانتا ہے، اور محبت وربط قلب ان سے رکھتا ہے اوران کے مسلک کو برحق جانتا ہے، غیر مقلد کہا ہو اور یہ سب کچھ حضرت سلمہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم تصور کرتا ہے اور یہ الفت ومحبت اس خاندان سے، حضرت ہی کی عطا فرمودہ ہے، اگر اس کا نام غیر مقلدی ہے تو یہ محض حضرت ہی کے فیض اثر سے حاصل ہوئی ہے، حضور معاف فرما کر، بندہ احقر کو اطلاع بخشی جاوے، کہ کار بندار شاد حضرت ہوں۔ فقط والسلام۔ بندہ حقیر عزیز الدین عفی عنہ۔(۱)

اس کے جواب میں حضرت مولانا کا جو رقیمہ گرامی صادر ہوا، اس کو بھی پڑھ لینا چاہئے، جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے، کہ حضرت مولانا مولوی عزیز الدین صاحب کو غیر مقلد نہیں سمجھتے تھے۔ گرامی نامہ درج ذیل ہے:

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ! بعد سلام مسنون آنکہ، میں نے تم کو یہ نہیں لکھا تھا کہ تم غیر مقلد ہو، اور نہ میں

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص: ۱۵۶-۱۵۷/۲، [رحیمیہ دہلی: ۱۳۵۲ھ]

ایسا سمجھیں۔ بلکہ یہ تحریر کیا تھا کہ اس وجہ سے لوگ تم پر تہمت غیر مقلدی کی رکھتے ہیں۔ احوال بندہ قرین عافیت ہے، سب احباب کو سلام مسنون کہہ دینا۔ والسلام کتبہ بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (۱)

مذکورہ مکتوبات میں، حضرت مولانا کے ایک اور خط کا بھی تذکرہ آیا ہے، یہاں اس کو درج کئے بغیر، یہ گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی، اس لئے وہ بھی نقل کیا جاتا ہے۔

از بندہ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی بعد سلام مسنون مطالعہ فرمانید۔ بندہ بخیریت ہے، تمہارے واسطے دعائے خیر کرتا ہے، حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ جو سوالات آپ کے آئے ہیں، بظاہر ان کا جواب نہ ہو سکے گا، کیونکہ میرے پاس ایسا لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور ان سوالات کے سبب تم پر تہمت غیر مقلدی کی رکھی جاتی ہے۔

فقط والسلام۔ سب احباب کو سلام مسنون۔ ۱۵ ار مضان یوم پنجشنبہ (۲)

فتاویٰ رشیدیہ کی تالیف و ترتیب مولانا عزیز الدین کی حضرت مولانا گنگوہی سے، یہی نسبت اور عقیدت و محبت تھی، جس نے ان کو حضرت کے فتاویٰ محفوظ و مرتب کرنے پر آمادہ کیا مولانا نے فتاویٰ رشیدیہ کی ترتیب و تالیف کا کس وقت ارادہ کیا تھا، اس کے لئے کیا کیا کوششیں کیں اور فراہمی فتاویٰ کے لئے خاصی جدوجہد اور عملی کیا طریقہ کار اپنایا، اندازہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے، حضرت کی وفات سے کم سے کم دو تین سال قبل، اس مجموعۂ فتاویٰ کی تالیف و اشاعت کا ارادہ کیا ہوگا۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ مولانا عزیز الدین صاحب کے مرتبہ، اس مجموعہ کے پہلے دونوں حصے، حضرت کی حیات میں مکمل و مرتب ہوگئے تھے، پہلا حصہ چھپنے کے لئے بھی چلا گیا تھا، دوسرا کتابت وغیرہ کے مرحلہ میں تھا۔

فتاویٰ رشیدیہ کی ترتیب میں مؤلف کا طریقہ کار مگر تعجب ہے کہ مولانا عزیز الدین صاحب نے، فتاویٰ رشیدیہ کی تدوین و ترتیب کے لئے، علمی فنی اصول پیش نظر نہیں رکھے اور اس مجموعہ فتاویٰ کی تالیف میں کسی طرح کی ترتیب کا اہتمام نہیں کیا۔ اس میں شامل مسائل اور فتاویٰ فقہی عنوانات و ابواب کے تحت مرتب و مدون نہیں کئے، جو فتوے درج ہیں، ان پر ضمنی عنوانات یا سرخیاں بھی نہیں لگائی گئیں۔

اگرچہ اس میں علمی ترتیب و تدوین کے اس بڑے اور اہم اصول کو پوری طرح نظر انداز کیا گیا ہے مگر ایک کام ایسا عمدہ اور مفید کیا ہے، جس کا اچھے تجربہ کار مصنفین بھی خیال نہیں فرماتے۔ یہ حضرت مولانا کے لکھے ہوئے فتاویٰ کے، سوال کرنے والوں کے نام اور مقام نیز سوال و جواب کے معلوم سنہ اور تاریخ کی عمدہ وضاحت ہے، جس سے ان مسائل کی بعض اندرونی

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص: ۱۵۷ حصہ اول [طبع اول مراد آباد: ۱۳۲۳ھ]
(۲) فتاویٰ رشیدیہ ص: ۱۵۶ حصہ اول [طبع اول مراد آباد: ۱۳۲۳ھ]

گرہیں کھلتی ہیں، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بات اور مسئلہ کہاں اور کیوں پیش آیا تھا، نیز یہ اہم کڑی بھی مل جاتی ہے، کہ حضرت نے یہ مسئلہ کب لکھا تھا۔ فتووں کی نقول یا اصل فتاویٰ فراہم کرنے والے اصحاب کے، ناموں اور مقامات کی صراحت ہے، مگر اس میں بھی کسی طرح کی ترتیب کا خیال نہیں کیا گیا، جو فتاویٰ جب دستیاب ہوا، بلا تاخیر اسی مقام پر شامل کر لیا گیا، خود مولانا عزیز الدین کے سوالات کے جواب میں صادر، فتاویٰ کے اندراجات سے بھی، اسی بے ربطی یا بے ترتیبی کا مشاہدہ ہو رہا ہے، ابتدائی دور کے لکھے ہوئے سوالات و فتاویٰ بعد میں اور بعد کے لکھے ہوئے ابتداء میں آ گئے ہیں۔ ممکن ہے جناب مرتب یہ خیال فرماتے ہوں کہ:

دریں کتاب پریشاں نہ بنی از ترتیب

عجب مدار، کہ جو حال من پریشان است

فتاویٰ کی تاریخ اور سنہ کتابت نقل کرنے کا اہتمام حضرت مولانا گنگوہی کا، اپنے خطوط فتاویٰ یا اور تحریرات پر سنہ تحریر و تالیف درج کرنے کا، بہت کم معمول تھا، صرف چند خطوط اور فتاویٰ پر سنہ تحریر ثبت ہے، کچھ اور خطوط یا فتوے وہ ہیں، کہ ان پر مہینہ رقم ہے مگر سنہ تحریر موجود نہیں، اس پہلو سے مولانا عزیز الدین کا یہ اہتمام قابل قدر ہے، کہ جو فتاویٰ کا سنہ تحریر سے مرقم و مزین تھے کی، جملہ تاریخہائے تحریر اور سنین کو اس فتوے کے حاشیہ پر، سائل کے نام کے ساتھ درج کر کے، محفوظ کر دیا ہے، اس کی مدد سے فتاویٰ کے حوالہ سے کئی اور باتیں دریافت کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ میں درج فتاویٰ کا زمانہ تحریر اگر چہ [جیسا کہ ذکر ہوا] ان میں سے بہت کم فتوؤں پر سنہ تحریر درج ہے، لیکن جس قدر پر بھی اندراجات ہیں، ان میں سے دو فتوے ایسے بھی ہیں جو ۱۳۲۲ھ کے لکھے ہوئے ہیں، جس میں ایک صفر ۱۳۲۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ ممکن ہے یہی فتاویٰ رشیدیہ میں درج آخری فتویٰ ہو۔

فتاویٰ رشیدیہ میں موجود فتاویٰ میں پہلا فتویٰ، مراد آباد کے معروف اہل حدیث عالم، مولانا مرزا حفیظ اللہ بیگ صاحب کے سوال کے جواب میں ہے، (۱) دوسرا بھی مراد آباد سے ہی تعلق رکھتا ہے، یہ احمد سعید خاں صاحب مراد آبادی کے سوال کے جواب میں ہے، یہ فتویٰ ۱۳۱۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔

فتاویٰ کا بڑا حصہ اہل مراد آباد و بجنور کے نام فتوؤں کا ہے مولانا عزیز الدین صاحب نے، ایک ایک فتوے کے سائل کا نام اور وطن اور ممکن ہو تو اس کا سنہ تحریر بھی، فتوے کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔ ان صاحبان کے ناموں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے، کہ فتاویٰ رشیدیہ میں درج سوالات و فتاویٰ میں سے بڑا حصہ، ان سوالات و فتاویٰ

(۱) مرزا حفیظ اللہ بیگ صاحب، مراد آباد کے ممتاز اہل حدیث علماء میں سے تھے، مولانا عزیز الدین صاحب نے اپنی خود نوشت تحریر میں مرزا صاحب کو: "مولانا مرزا امام الموحدین سرآمد محققین حفیظ اللہ بیگ صاحب" کے موقر الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص: ۵۶۳ [طبع اول دہلی]

کا ہے، جو اصحاب مراد آباد نے دریافت کئے تھے، اس لئے سب سے بڑی تعداد، اہل مراد آباد کے سوالات کے جواب میں ہے، یہ پورے مجموعہ کا ایک تہائی یا اس سے کچھ زائد حصہ ہے۔ اس کے بعد، ضلع بجنور [اور اس کے قصبات ونواح] کے سائلین کے فتوے شمار کئے جاسکتے ہیں، ان دونوں مقامات سے دستیاب فتاویٰ، فتاویٰ رشیدیہ کے آدھے سے زیادہ حصہ کا احاطہ کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی دسیوں مقامات سے، موصول فتاویٰ نے جگہ پائی ہے، خود مولانا عزیز الدین صاحب کے دریافت کئے ہوئے، تقریباً ساٹھ سوالات اور ان کے جوابات، بلاترتیب موقع بہ موقع درج ہیں۔

نہایت تعجب ہے کہ جہاں سے سب سے زیادہ فتوے ملنے چاہئیں تھے، مثلاً گنگوہ، سہارنپور، دیوبند، کاندھلہ، دہلی اور پنجاب کے مواضع وقصبات وغیرہ، جہاں حضرت مولانا گنگوہی کے متوسلین کے پاس حضرت کے لکھے ہوئے، فتاویٰ رشیدیہ کے مندرجات سے سوگنا فتاوے موجود تھے، مگر وہاں سے کسی نے دست تعاون نہیں بڑھایا اور اس مجموعۂ فتاویٰ میں شامل کرنے کے لئے، مولوی عزیز الدین صاحب کی مکرر گزارشات کے باوجود کوئی فتویٰ نہیں بھیجا۔

ایک اور اہتمام یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مؤلف فتاویٰ رشیدیہ نے، حضرت مولانا گنگوہی کے بدست خاص لکھے ہوئے فتاویٰ کو، اپنی کتاب میں اولیت دی ہے اور جو فتاویٰ مولانا محمد یحییٰ صاحب کے قلم کے مکتوبہ ہیں، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بلاتکلف "بقلم مولوی محمد یحییٰ" کی صراحت کی ہے۔ اوپر آچکا ہے کہ اگر کوئی فتویٰ مولانا محمد یحییٰ کے علاوہ، حضرت کے کسی اور خادم وکاتب کے قلم سے ہے، تو اس کی بھی وضاحت کردی ہے۔ اور وہ متواتر اس کا بھی اعلان کرتے رہے اور پابندی سے یہ اشتہار چھاپتے رہے کہ:

"ان تمام فتاویٰ کی اصل ہمارے پاس موجود ہے، جو صاحب ملاحظہ فرمانا چاہیں، ملاحظہ فرمائیں"

مولوی عزیز الدین نے پوری زندگی اصل فتاویٰ محفوظ رکھے صرف یہی نہیں، بلکہ مؤلف فتاویٰ رشیدیہ نے، اصل فتوؤں کی تمام عمر حفاظت کی اور ان کی وفات کے بعد بھی برسوں تک، یہ ذخیرہ جوں کا توں موجود اور محفوظ رہا، آج سے تقریباً پندرہ سال قبل تک اس کی موجودگی کی اطلاع ہے، اس کے بعد اس کا حال معلوم نہیں۔ اس پوری روداد میں اگر کوئی کمی ہے تو یہ ہے، کہ مولوی عزیز الدین صاحب کے بار بار اعلانات کے باوجود کسی نے بھی مطبوعہ نسخہ کی اصل فتاویٰ سے مطابقت کی زحمت نہیں فرمائی، پچاس سال سے زائد عرصہ تک یہ تمام فتاویٰ رکھے رہے، موجود رہے مگر ان کے براہ راست مطالعہ کا ارادہ نہیں کیا گیا۔

مزید فتاویٰ اور آخری حصوں کے لئے اور جدوجہد مولانا عزیز الدین صاحب نے فتاویٰ رشیدیہ کی ترتیب وطباعت کے لئے، غالباً بڑا منصوبہ بنایا تھا، اس لئے ذاتی طور پر فتاویٰ کی جستجو اور فراہمی کے علاوہ، کئی مرتبہ اشتہارات بھی شائع کئے، متعلقہ اصحاب کو خطوط لکھے، بار بار اشتہار بھجوائے، عریضے پیش کئے مگر اس ذخیرہ کے حامل اکثر اصحاب نے

مولانا عزیز الدین کی گذارش پر کان نہیں دھرا، اور اس بڑی دینی فقہی خدمت وکاوش کو لائق اعتنا نہیں سمجھا مگر اس بے توجہی سے مولوی عزیز الدین بددل نہیں ہوئے، اپنے کام میں برابر لگے رہے۔

مجموعہ فتاویٰ رشیدیہ کا چوتھا اور پانچواں حصہ؟ مولانا عزیز الدین کے فتاویٰ رشیدیہ کے، تین حصے تو معروف اور دستیاب ہیں، ان کے علاوہ دو حصے اور بھی تھے جو بالکل مفقود ومعدوم ہیں، حال آں کہ چوتھا حصہ مکمل اور کتابت ہوکر چھپنے کے لئے چلا گیا تھا، پانچواں زیر ترتیب تھا اور مولانا کی بعض تحریرات سے جھلکتا ہے، کہ ان کا اس سلسلے کو اور آگے بڑھانے کا خیال تھا، مگر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ بڑا کام کیوں ناقص وناتمام رہ گیا اور کس وجہ سے اس کا چوتھا یا پانچواں حصہ عام نہیں ہوا۔ اور بعد کے حصے تو وجود میں آنے سے بھی محروم رہ گئے۔

پہلی طباعت فتاویٰ رشیدیہ کے پہلے حصہ کی طباعت کب شروع ہوئی، اس کا تذکرہ نہیں ملتا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کی کتابت حضرت مولانا کی حیات میں مکمل ہوگئی تھی، طباعت بعد میں پوری ہوئی، تکمیل طباعت کی، کتاب کے آخری صفحہ پر، ان الفاظ میں صراحت ہے:

"الحمدللہ والمنۃ کہ بتاریخ ۱۵/ ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ [۱۱/ جنوری ۱۹۰۶ء] کو یہ پہلا حصہ اختتام کو پہنچا" بفضلہ وکرمہ!(۱)

یعنی فتاویٰ رشیدیہ کے پہلے حصہ کی، پہلی طباعت، حضرت مولانا گنگوہی کی وفات [۹/ جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ/ ۵/ اگست ۱۹۰۵ء] کے تقریباً پانچ مہینہ کے بعد مکمل ہوکر آ گئی تھی۔ یہ نسخہ برلاس پریس اور شمس المطابع مرادآباد میں چھپا تھا، یہ سب سے پہلی طباعت، ایک سو اکسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں آخری ٹائٹل کا ایک صفحہ بھی شامل ہے۔

سرورق کے بعد، اصل کتاب سے پہلے، اٹھائیس صفحات ہیں، جس میں اول صحت نامہ اغلاط ہے، جو ڈیڑھ صفحوں پر آیا ہے، اس کے بعد خاصی مفصل فہرست مضامین ہے، جو ساڑھے بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ بعد ازاں فتاویٰ شروع ہوگئے ہیں۔ سرورق کے بالکل آخری صفحہ پر، مولوی سید فرید احمد صاحب وفا مرادآبادی کا نوشتہ، فقرۂ تاریخ اور قطعہ تاریخ ہے۔

فقرہ تاریخ یہ ہے: "رسالہ فتاویٰ رشیدیہ" ۱۳۲۳ھ، قطعہ تاریخ بھی ملاحظہ ہو:

چواں نسخۂ بے بدل طبع شد ز زحمت بعید و برحمت قریب
چہ تاریخ احسن، برآمد وفا ملک گفت: "زیبا عجیب وغریب"
۱۳۲۳ھ (۲)

(۱) فتاویٰ رشیدیہ حصہ اول۔ طبع اول ص:۱۶۱۔ (۲) فتاویٰ رشیدیہ۔ طبع اول، سرورق کا آخری، چوتھا صفحہ۔

اس کے نیچے حقوق طباعت محفوظ ہونے کا اعلان شائع کیا گیا ہے:

''حق کاپی رائٹ کتاب بنام عزیز الدین وعلی نظر، بذریعہ رجسٹری باضابطہ محفوظ ہے''(۱)

حصہ دوم کی پہلی اشاعت پہلے حصہ کی طباعت کے بعد جلد ہی حصہ دوم بھی شائع ہو گیا تھا، حصہ دوم افضل المطابع مرادآباد سے چھپا۔ آخری صفحہ کے بعد ٹائٹل کے آخری صفحہ پر، چھے شعروں پر مشتمل قطعۂ تاریخ درج ہے، جو منشی محمود علی گرامی میرٹھی کی یادگار ہے۔ کہا ہے:

تاریخ طبع

از لطائف طبع مؤرخ بے مثال، شاعر شریں مقال، منشی محمود علی صاحب گرامی میرٹھی

لقد رضاء نجم الهدیٰ فی الوری — فسر القلوب وزال الکید
بهذا الفتاویٰ فطوبیٰ لکم — فقد جاء بشری لجمع العبید
کہ مہ بجلوہ چنیں مہر دین — منور بصد مہر شد ماہ عید
خزانہ ملا دین اسلام کا — ملی باب رضوان کی گویا کلید
ضروری مسائل باحسن وجوہ — ہیں ارشاد مرشد سے دین کے رشید
کہا ہو کے خوش ہاتف غیب نے — نفیس الفتاوی امام رشید

۱۳۲۴ھ

اس کے اختتام پر خاتمۃ الطبع ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

خاتمة الطبع

الحمد لله والمنة کہ تاریخ ۳۰ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ کو یہ مجموعہ متبرکہ حصہ دوم، جس میں تقریباً تعدادی چھ سو مسائل ہیں، اختتام کو پہنچا۔

حصہ سوم کی پہلی اشاعت مولانا عزیز الدین صاحب کی یہ کاوش اہل نظر کے یہاں مقبول ہوئی تھی، اس لئے اس سلسلہ کو آگے بڑھانے اور جاری رکھنے کی فرمائشیں آتی رہیں، خود مولانا عزیز الدین صاحب بھی، ان سے اس کے طالب وجویا تھے، دوسرا، تیسرا حصہ مکمل ہوتے ہی چھپنے کے لئے چلا گیا تھا۔ اس لئے تیسرا حصہ، فضل حسین بسمل کے اہتمام سے افضل المطابع، مرادآباد سے ۲۰/ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ [۲۴/ مارچ ۱۹۱۰ء] میں شائع ہوا۔ خاتمۃ الطبع درج ذیل ہے:

(۱) فتاویٰ رشیدیہ۔ طبع اول، سرورق کا آخری، چوتھا صفحہ۔

الحمد لله والمنة کہ بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کو یہ مجموعہ متبرکہ حصہ سوم، جس میں تقریباً تعدادی چار سو مسائل ہیں، اختتام کو پہنچا۔ (۱)

یہ کلمات ص: ۱۶۰ کے اختتام پر ہیں، ص: ۱۶۱ سے ص: ۱۷۲ تک فہرست مضامین ہے، ص: ۱۷۳ سے ۱۷۶ تک صحت نامہ حصہ سوم آیا ہے، اسی صفحہ پر درج ایک اشتہار و اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کو، دیوبند کے جلسہ دستار بندی تک، بازار میں لے آنے کے خیال سے، کتابت وطباعت میں جلدی کی گئی، اس کی وجہ سے اس کی صحت کا خاطر خواہ اہتمام نہیں ہو سکا۔

لیکن یہ اعلان اس اشاعت کا نقطہ اختتام نہیں ہے، ایک صفحہ اور ہے، اس پر حضرت مولانا گنگوہی کا قطعہ تاریخ وفات ہے، جو فارسی کے انیس اشعار پر مشتمل ہے۔ سرورق کے آخری چوتھے صفحہ پر، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا تھانوی کی تصانیف کی تاجرانہ فہرست ہے، یہ اشتہار بھی اس کی ایک ضمنی تصدیق ہے کہ مولانا عزیز الدین صاحب [کم سے کم، اس اشاعت کے وقت تک] ان حضرات کے دامن گرفتہ، دینی فقہی نظریات اور سلوک وتصوف میں ان کے طریقہ پر تھے۔

حصہ چہارم و پنجم کی کتاب وطباعت فتاویٰ رشیدیہ کی ترتیب واشاعت کا کام، تیسرے حصہ پر ختم نہیں ہوا تھا، اس کے بعد بھی کم سے کم دو حصے [چہارم، پنجم] اور مرتب ہوئے تھے۔ چوتھے حصہ کے شائع کرنے یا زیر اشاعت ہونے کا، مولانا عزیز الدین صاحب فتاویٰ رشیدیہ کی پہلی، دوسری اشاعت کے مختلف حصوں میں، کئی مرتبہ اعلان کیا، حصہ سوم کے طبع اول کے سرورق کے دوسرے صفحہ پر، ایک مفصل اشتہار میں، اس کا دو مرتبہ ذکر آیا ہے۔ اس اشتہار سے ان فتاویٰ کی اصلیت پر شبہ کا بھی جواب ملتا ہے، اس لئے یہاں یہ اشتہار نقل کیا جاتا ہے۔ لکھا ہے:

التماس

الحمد للہ کہ اکثر حضرات شائقین کی توجہ دلی اور صدق سعی نے ہم احقران کو، تیسرے و چوتھے حصہ فتاویٰ رشیدیہ کی جانب ہمت دلائی اور اپنے دل ربا و جاندہ قلمی فتاویٰ، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے، آغوش محبت سے جدا کر کے، بسبیل ڈاک ہم احقران کو، ان کے نام ارسال کیے، ہم کو معزز و ممتاز اور کل ناظرین کو مستفیض فرمایا، جزاک الله فنعم الجزاء۔

جس کسی صاحب کو کسی مسئلہ میں تردد پیش آئے، وہ مرتفع ہو سکتا ہے، ان کل فتاووں کی اصل ہمارے اور ہمارے احباب کے پاس موجود ہے۔ یہ تیسرا حصہ حاضر خدمت، چوتھا حصہ انشاء اللہ بہت جلد طبع ہو کر،

(۱) فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم طبع اول ص: ۱۶۰ [مراد آباد: ۱۳۲۸ھ]

ارسال خدمت بعد.................آنے کے بعد کیا جائے گا۔ دیگر مشاغل کی وجہ سے اس وقت تک مکمل نہ ہو سکا۔

الملتمس

عزیز الدین علی نظر مراد آباد محلہ ساہو

حصہ اول کی تیسری اشاعت کے ساتھ بھی ایک اشتہار چھپا ہوا ہے، اس میں بھی یہی لکھا ہے کہ:

''چوتھے حصہ کی تیاری ہے''

ان اطلاعات کی ایک قلمی تحریر سے بھی تصدیق ہو رہی ہے جو راقم۔سطور کے پاس محفوظ ہے، یہ فتاویٰ رشیدیہ کے متعلق ہے، اگر چہ اس پر لکھنے والے کا نام موجود نہیں مگر اس میں مؤلف فتاویٰ، مولانا عزیز الدین مراد آبادی اور حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کا حوالہ ہے، اور یہ اطلاع بھی، کہ چوتھا حصہ چھپ کر [اس کا نسخہ] مولانا محمد یحییٰ صاحب تک پہنچ گیا ہے اور پانچواں حصہ کاتب کے پاس ہے۔ تحریر کی نقل ملاحظہ ہو:

''فتاویٰ رشیدیہ بمقام مراد آباد، محلہ ساہو.........بخدمت مولوی عزیز الدین علی نظر، کتب فروش بمقام سہارنپور، مدرسہ مظاہر علوم، بخدمت مولوی محمد یحییٰ صاحب اول، دوم، سوم، چہارم، فتاوی رسیدہ، پنجم بکاتب رسیدہ''

ان اقتباسات واطلاعات سے جھلکتا ہے کہ فتاویٰ کا چوتھا حصہ مرتب ہو کر چھپنے چلا گیا تھا، پانچواں زیر ترتیب تھا، اگر بالفرض پانچواں حصہ مکمل نہیں ہو سکا تھا، جس کی کوئی وجہ معلوم نہیں، تو چوتھے حصہ پر کیا گزری۔ دو برس چھپ جانے کے باوجود، چُھپا کیوں رہا، آج تک گم نام والا پتہ کیوں ہے، یہ حصہ جب اس مرحلہ تک آ گیا تھا، کہ مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کی خدمت میں بھیج دیا جائے تو اور قدر داں اس سے محروم و بے خبر کیوں رہے۔ چوتھے پانچویں حصہ کے حوالہ سے سوالات کے جوابات، ان دونوں حصوں کی بازیافت اور ان کی اشاعت، حضرت مولانا کے فتاویٰ کے ذخیرہ اور مولانا عزیز الدین کے کام کی، تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے۔

مطبوعہ حصوں کی مکرر اشاعتیں فتاویٰ رشیدیہ حسب توقع نہایت مقبول ہوا، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس لئے قلیل مدت میں کئی مرتبہ چھپا۔ مؤلف نے پہلے دونوں حصے اپنے پتہ سے، مراد آباد سے کم سے کم تین مرتبہ شائع کئے، تیسرے حصہ کی دو مرتبہ طباعت ہوئی اور اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ یہاں ان میں سے اہم طباعتوں کا، کچھ تذکرہ مفید ہوگا۔

اشاعت دوم، مراد آباد پہلا حصہ طباعت کے بعد جلد ہی کم یاب ہو گیا تھا، طلب بڑھتی جا رہی تھی، اس لئے مولانا عزیز الدین صاحب نے طبع اول کو، دوبارہ جوں کا توں شائع کر دیا، اس پر تاریخ اشاعت بھی وہی درج ہے، جو پہلی اشاعت میں تھی، حالاں کہ یہ حقیقت میں پہلی اشاعت نہیں، بلکہ پہلی اشاعت کا ثنیٰ [Re Print] ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلی اشاعت براس پریس سے چھپی تھی، [جیسا کہ اس کے تعارف گزر گیا ہے،] یہ عکس یا ثنی، افضل المطابع، مراد آباد سے چھپا تھا۔ مطبع کی صراحت کے علاوہ، دونوں میں سے ایک فرق یہ بھی ہے، کہ پہلی طباعت کا سرورق ہلکے رنگ کا باریک کاغذ کا ہے، دوسری طباعت کا سرورق زرد دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔

اشاعت سوم، مراد آباد حصہ اول کی دوسری اشاعت بھی فروخت ہو گئی، تو اس حصہ کو مولانا عزیز الدین صاحب نے ایک مرتبہ اور چھاپا، یہ طباعت، پہلی طباعت کے تین سال بعد اشاعت پذیر ہوئی، یہ بھی مطبع شمس المطابع مراد آباد سے، حاجی شمس الدین کے اہتمام سے چھپی تھی۔ یہ پہلی دونوں طباعتوں سے کسی قدر مختلف ہے، اس کے سرورق کے دوسرے اندرونی صفحہ پر پورے صفحہ کا اشتہار ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

فتاویٰ رشیدیہ حصہ اول طبع ثالث

عرصہ ہوا یہ حصہ ہم نے بڑی کوشش سے طبع کرا کر، حضرات ناظرین کی خدمت میں عموماً اور برادران دینی کی خدمت میں خصوصاً، پیش کیا تھا، الحمد للہ کہ ہماری سعی مقبول خاص و عام ہوئی، شائقین کی طلب کی وجہ سے سہ بارہ طبع کی نوبت آ گئی، کیوں نہ پسندیدۂ عالم ہو کہ محدث دہر، فقیہ عصر، قطب وقت، حضرت مولانا مولوی رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کے، یہ نہایت کارآمد فتاوے ہیں، کہ جن سے ہر چھوٹا اور بڑا مستغنی نہیں ہے۔ اس کتاب کے تین حصہ طبع ہو چکے ہیں، چوتھے حصہ کی تیاری ہے، قیمت فی حصہ ۱۰/ ہے، ان تمام فتاووں کی اصل ہمارے پاس موجود ہیں، جو صاحب چاہیں ملاحظہ فرمائیں۔

جن صاحب کے پاس، حضرت مولانا قدس سرہ کے فتاوے موجود ہوں اور ان کا طبع ہونا بھی منظور ہو، تو ہمارے پاس بھیج دیں، انشاء اللہ چوتھے حصہ میں طبع ہوں گے۔

اس طباعت کے آخری صفحہ [سرورق] پر بھی طبع اول، قطعہ تاریخ اور وہی عبارت درج ہے، جو پہلی دونوں اشاعتوں پر تھی مگر دونوں میں اس سے امتیاز ہو جاتا ہے، کہ پہلی دونوں طباعتیں ایک سو باسٹھ صفحات پر مشتمل تھیں، اس کے ایک سو چونسٹھ صفحے ہیں، یہ صفحات اصل کتاب میں اضافہ نہیں، بلکہ ان صفحات پر کتابوں کی تاجرانہ فہرست چھپی ہے۔ یہ اشاعت غالباً ۱۳۲۷ھ [۱۹۰۹ء] کی ہے۔

حصہ سوم کی اشاعت دوم فتاویٰ کا تیسرا حصہ افضل المطابع مرادآباد سے ۱۳۲۸ھ [۱۹۱۰ء] میں چھپا تھا، اس حصہ کی دوسری اشاعت بھی اسی مطبع سے نکلی، اس پر سنہ طباعت موجود نہیں مگر دونوں میں چند صفحات کی کمی زیادتی ہے۔ پہلی اشاعت ایک سو چھہتر (۱۷۶) صفحات پر ہے، دوسری میں ایک سو چھیاسی صفحات ہیں۔

مرتب کے اہتمام سے تینوں حصوں کی رحیمیہ سنہری مسجد دہلی سے اشاعت فتاویٰ کی بار بار اشاعت کے باوجود، اس کی پذیرائی اور مقبولیت روزافزوں تھی، اس لئے مرتب اور ناشر نے، اس کی ایک بہتر، نسبۃً عمدہ اور یکساں طباعت کا دہلی میں انتظام کیا تھا۔ یہ نسخہ، حافظ عبدالغنی صاحب، کتب خانہ رحیمیہ، سنہری مسجد دہلی کے نام سے چھپا تھا، اس پر سنہ طباعت درج نہیں، سرورق کے آخری صفحہ پر، پہلی تینوں اشاعتوں کی طرح، مولانا عزیزالدین صاحب کا نام اور پتہ چھپا ہے، اس میں بھی وہی مضمون ہے، جو اوپر نقل ہو چکا ہے۔ اس طباعت کا صرف پہلا حصہ میری نظر سے گزرا ہے، اس لئے اس ادارہ سے دوسرے، تیسرے حصہ کی طباعت کے متعلق، کچھ کہنا ممکن نہیں۔

مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند: ۱۳۳۳ھ فتاویٰ رشیدیہ کی جو پذیرائی ہوئی، اس کا تقاضہ بلکہ حق بھی تھا کہ اس کا ایک اچھا ایڈیشن دیوبند سے شائع ہو، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے، اپنے مطبع قاسمی دیوبند سے اس کی طباعت کا انتظام کیا۔ یہ طباعت مولانا عمادالدین شیرکوٹی کے اہتمام سے چھپی اور اس وقت تک کی تمام طباعتوں میں سب سے بہتر ہے۔ مطبع قاسمی کا مطبوعہ نسخہ ۱۳۳۳ھ [۱۹۱۵ء] میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا اور غالباً مکمل کتاب [تینوں حصے] ایک ساتھ چھپے تھے، اس کا صرف دوسرا حصہ راقم سطور کے سامنے ہے، دوسرے حصوں کی تلاش و دریافت میں کامیاب نہیں ہوا۔

مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ جامع مسجد دہلی: ۱۳۴۸ھ، تا ۱۳۵۲ھ مطبع قاسمی کے بعد جو طباعت راقم کو ملی، وہ کتب خانہ رحیمیہ کی دوسری طباعت ہے، جو تصحیح، ترتیب، تبویب، کاغذ اشاعت وغیرہ، ہر پہلو سے، پہلی طباعتوں سے بہت بہتر ہے۔

اس طباعت کے لئے تصحیح و تبویب کی خدمت، مولانا مفتی کفایت اللہ کی نگرانی اور سرپرستی میں ہوئی تھی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب اس کی تخریج مسائل بھی کرائی تھی اور ایک جامع حاشیہ بھی لکھوایا تھا، یقیناً اس حاشیہ کی اشاعت سے، فتاویٰ رشیدیہ کی افادیت و منزلت میں بہت اضافہ ہوتا مگر افسوس ہے کہ یہ حاشیہ، کتاب کی ضخامت اور قیمت بہت بڑھ جانے کے خوف سے [کیوں کہ حاشیہ بہت مفصل اور اصل کتاب کے برابر تھا] شائع نہیں کیا گیا۔

یہ نسخہ، تین علیحدہ حصوں میں، کتب خانہ رحیمیہ، سنہری مسجد دہلی سے علیحدہ علیحدہ چھپا تھا، پہلا حصہ ۱۳۴۸ھ [۱۹۳۰ء] میں چھپا، یہ اشاعت بہت مقبول ہوئی، بار بار چھپتی رہی اور کثرت سے فروخت ہوئی اور اب تک بھی، فتاویٰ رشیدیہ کا بنیادی

نسخہ اسی کو سمجھا جاتا ہے۔ رحیمیہ کی اس کے اشاعت کے بعد سے، فتاویٰ رشیدیہ کے جس قدر بھی نسخے ہیں، وہ تمام اسی اشاعت کی گویا نقل ہیں، کسی مرتب وناشر نے ترتیب وتبویب میں جزوی ترمیم کی ہے، یا بعض عنوانات میں کچھ حذف واضافہ کیا ہے، عموماً نسخہ وہی ہے جو رحیمیہ سے چھپا تھا۔

کتب خانہ رحیمیہ سے شائع چند اور اشاعتیں رحیمیہ کی طباعتیں کچھ اس درجہ مقبول اور پسندیدہ خاص وعام ہوئیں، کہ اس ادارہ نے فتاویٰ کے کئی ایڈیشن متواتر چھاپے اور یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ رحیمیہ دہلی کی اشاعت کے بعد، دہلی کے یا کسی اور جگہ کے کسی ادارہ نے، فتاویٰ رشیدیہ چھاپا ہو، میرے علم میں نہیں مگر ۱۹۴۷ء کے بعد، غالباً سب سے پہلے کراچی کے ناشرین نے، فتاویٰ رشیدیہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، ان کی اور رحیمیہ کی نقول ہندوستان میں بھی چھپتی رہیں، بعد میں دیوبند سے بار بار چھپی اور چھپ رہی ہے، بیس سے زائد طباعتیں میری نظر سے گذری ہیں مگر ان میں کوئی نئی بات، ترتیب، تصحیح مقابلہ وغیرہ کی کوئی کوشش مجھے نظر نہیں آئی۔

کراچی کی طباعتیں اور فتاویٰ رشیدیہ میں چند اضافات وترمیمات ۱۹۴۷ء کے بعد، کراچی سے فتاویٰ رشیدیہ کی نئی اور متواتر، طباعت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، اس میں بھی تصحیح وتعلیق وغیرہ کا کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا گیا۔ صرف ایک اشاعت مطبع سعیدی کراچی کی، ایسی نظر سے گذری تھی، جس پر ایک تحریر مولانا سبحان محمود صاحب کی چھپی ہوئی تھی کہ ہم نے اس کی تبویب اور تصحیح کی ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں [ہند پاکستان دونوں ملکوں میں] دوسروں کی کتابوں، مطبوعات کو، بلا کسی اجازت کے، غیر شرعی طور پر [چوری سے] چھاپنے کی وبا عام ہے، اس لئے اس طباعت کی نقلیں بھی [شروع کی تصدیقات وگذارشات نکال کر] ہند پاکستان میں کثرت سے چھپیں۔ پھر کراچی ہی کے کسی ناشر نے اپنی راہ الگ نکالی، فتاویٰ کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا، جس میں حضرت مولانا گنگوہی کے فقہی ارشادات وملفوظات بھی شامل کر لئے۔ اگر چہ یہ طریقہ بالکل غلط اور قطعاً غیر علمی تھا، فقہ وفتاویٰ کے ذمہ دارانہ کام میں، اصولاً، ملفوظات کی [جن کا حوالہ بھی درج نہ ہو] کچھ اہمیت نہیں، مگر جب افادی پہلو پر "کل جدید لذیذ" کا نظریہ غالب ہو، ایسے میں استدلال واعتماد کی بات بے فائدہ ہوتی ہے، یہی اس طباعت میں بھی ہوا، کہ ملفوظات والا نسخہ چھپتے ہی، اس کی نقلیں عام ہوگئیں۔ اس وقت سے یہی نسخہ چھپ رہا ہے، چل رہا ہے۔

فتاویٰ کی ملفوظات کے ساتھ کراچی سے اشاعت یہ طباعت جس میں ملفوظات فتاویٰ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں، کس نے مرتب کیا تھا اور سب سے پہلے کس نے اس کو شائع کیا، اس کا صحیح علم نہیں مگر اس قسم کی جو سب سے پہلی اشاعت، راقم کو ملی، وہ کارخانہ محمد علی، دستگیر کالونی، کراچی [پاکستان] کی ہے، اس میں مرتب کا نام اور سنہ اشاعت موجود نہیں، غالباً ۱۴۰۰ھ کے قریب کی اشاعت ہے، اس میں تبویب وترتیب میں مزید عمدگی اور بہتری کا اعلان

کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ میں ملفوظات کی شرکت، اس ادارہ کی ''حرکت'' نہیں تھی، یہ کام اس سے پہلے کسی اور ناشر نے کیا تھا، زیر نظر نسخہ [کارخانہ محمد علی، کراچی] میں، ملفوظات کو صرف موضوعات کے لحاظ سے، مرتب کر کے پیش کرنے کی کوشش ہوئی ہے، یعنی ملفوظات ہر اک باب کی مناسبت سے، علیحدہ علیحدہ کر کے، اس باب کے آخر میں درج کئے گئے ہیں۔ ناشر نے لکھا ہے:

''حضرت گنگوہی کے یہ فتاوے یوں تو اس سے پہلے بھی شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ہم نے جدید عکسی ایڈیشن کی ترتیب وتہذیب کو، فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا ہے اور عصر حاضر کی ذہنی اور مزاجی کیفیات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ [یعنی چہ؟ نور] ہم نے جملہ مسائل کو ان کو نوعیت اور اقسام کے اعتبار سے، الگ الگ کتاب اور ابواب کے ماتحت ایک جگہ کر دیا ہے، اس طرح قاری کو کسی بھی مسئلہ میں اس کا جواب تلاش کرنے میں، دقت اور پریشانی نہ اٹھانی پڑے گی، فہرست مضامین میں متعلقہ مسائل کی کتاب اور باب پر نظر ڈالئے اور صفحہ متعلقہ کھول کر، جواب حاصل کر لیجئے۔

اسی طرح پچھلی اشاعت میں ملفوظات منتشر ومتفرق تھے، ہم نے انہیں بھی ابواب کے اختتام پر، ایک جگہ کر دیا ہے، ان تمام مساعی اور کوششوں کے پیچھے یہ جذبہ کار فرما تھا کہ، اس مفید چیز کے افادے کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر دیا جائے''۔ (۱)

تالیفات رشیدیہ فتاویٰ رشیدیہ کی ایک معروف اشاعت وہ ہے، جو تالیفات رشیدیہ کے نام سے ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء میں ادارہ اسلامیات، لاہور سے پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ اس میں فتاویٰ کے علاوہ، حضرت مولانا گنگوہی کی چند تالیفات بھی شامل وشائع کی گئی ہیں۔

اس اشاعت میں شامل، فتاویٰ غالباً اس اشاعت کی نقل ہیں، جس کا اشاعت کراچی کے تحت تعارف گزرا ہے، اس کی تمہید اور مندرجات بھی وہی ہیں، جو نسخہ کراچی کے تھے، مگر تفصیلات سے قطع نظر، یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ دونوں اشاعتیں تصحیح اور اصول سے مطابقت کی نہایت محتاج ہیں۔ (۲) نیز اس کو مجموعہ تالیفات رشیدیہ کہنا بھی شاید صحیح نہیں، اس لئے کہ اس میں حضرت مولانا کی جملہ تالیفات شامل نہیں، جو ہیں وہ مجموعہ فتاویٰ کے ضمیمہ کے طور پر ہیں، اگر اس کا نام ''فتاویٰ

---

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص: ۳ [ناشران: محمد علی کارخانہ اسلامک کتب۔ کراچی: ۳۸۔ بلا سنہ]

(۲) ان دونوں طباعتوں کی فروگذاشتوں، بعض بلا حوالہ اضافوں، نیز کتابت کی بڑی غلطیوں پر مفصل مضامین کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہمارے بے شمار دینی اداروں میں فتاویٰ رشیدیہ اور تالیفات رشیدیہ سے بلا تکلف رجوع کیا جاتا ہے مگر کسی نے بھی اس کی تصحیح پر توجہ نہیں کی، اس کی فروگذاشتوں پر نظر نہیں ڈالی، اس کے سقطات، اضافوں اور کم وبیش پر، علمی تبصرہ اور فنی جائزہ کی ضرورت اب تک محسوس ہوتی ہے

رشیدیہ مع چند تالیفات حضرت مولانا گنگوہی" ہوتا تو زیادہ موزوں اور برمحل تھا۔

پشتو ترجمہ حضرت مولانا کے شاگردوں اور متسبین کا سلسلہ، موجودہ پاکستان کے آخری صوبہ اور افغانستان تک پھیلا ہوا تھا، (۱) صوبہ سرحد اور پشتو بولنے والے تمام علاقوں میں، حضرت مولانا کے اثرات، حضرت سے علمی وابستگی اور حضرت کے علوم سے استفادہ کا سلسلہ تھا، اس رابطہ اور ارادت کی وجہ سے حضرت کے مجموعہ فتاویٰ کے، مقامی زبان پشتو میں ترجے بھی کئے گئے۔ فتاویٰ رشیدیہ کا پشتو میں ایک ترجمہ، مولانا لطافت الرحمٰن سواتی صاحب [ولادت: ۱۹۲۸ء] نے کیا تھا۔ مولانا، پاکستان کے ممتاز عالم مصنف، مدرس، مفتی اور اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔ (۲) یہ ترجمہ شائع ہوا ہے یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں، اس کا تعارف راقم سطور کو نہیں ملا۔

پشتو کا ایک اور ترجمہ پشاور صوبہ سرحد [حال خیبر پختون خواہ] کے ایک ناشر نے چھاپا ہے یہ ترجمہ مولانا عبداللطیف اسکندر نے کیا ہے جو تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہنوز میری دسترس سے دور ہے، اس لئے اس ترجمہ کے مزید تعارف سے قاصر ہوں۔

فتاویٰ رشیدیہ کی تخریج مسائل اور تحقیق جزئیات فتاویٰ رشیدیہ کے مضامین ومندرجات اول سے اہل فتاویٰ کی توجہ کا مرکز رہے اس سے یہ بھی خیال رہا، کہ ان کے مندرجات وماخذ کی تلاش کی جائے، اس مبارک کام کی تکمیل اور فتاویٰ کی تخریج کے لئے، کئی علمائے کرام اور مفتی صاحبان نے علیحدہ علیحدہ کوشش کی، جس میں، میری ناچیز معلومات کے مطابق سب سے پہلا مکمل اور جامع ترین حاشیہ یا تحقیق فتاویٰ وہ ہے، جو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہ جہانپوری دہلوی کی زیر نگرانی مرتب ہوا تھا۔

(ا) حضرت مفتی کفایت اللہ کی نگرانی میں حاشیہ فتاویٰ رشیدیہ کی تالیف کتب خانہ رحیمیہ دہلی سے فتاویٰ کے شائع نسخہ کو جو قبول عام حاصل ہوا، اس کی وجہ سے خیال ہوا تھا کہ اس کا ایک اور اعلیٰ عمدہ نسخہ، فتاویٰ کے ماخذ کی تحقیق اور مکمل حوالوں کے ساتھ، علمی انداز کا کام ہو کر، فتاویٰ کے ساتھ چھپنا چاہئے، اس بڑے کام کے لئے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب سے گذارش کی گئی، مفتی صاحب نے سنبھل [مراد آباد، یوپی] کے ایک عالم سے، اپنی نگرانی میں یہ کام کرانے کا ارادہ

---

(۱) ان دونوں طباعتوں کی فروگذاشتوں، بعض بلاحوالہ اضافوں، نیز کتابت کی بڑی غلطیوں پر مفصل مضامین کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہمارے بے شمار دینی اداروں میں فتاویٰ رشیدیہ اور تالیفات رشیدیہ سے بلاتکلف رجوع کیا جاتا ہے مگر کسی نے بھی اس کی تصحیح پر توجہ نہیں کی، اس کی فروگذاشتوں پر نظر نہیں ڈالی تھی، اس کے سقطات، اضافوں اور کم وبیش پر، علمی تبصرہ اور فنی جائزہ کی ضرورت اب تک محسوس ہوتی ہے۔

(۲) مولانا لطافت الرحمٰن صاحب کے مختصر تعارف اور اس ترجمہ کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: مفتی اعظم [مولانا مفتی محمد شفیع] نمبر: ماہ نامہ البلاغ کراچی: [۱۳۹۹ھ- کراچی] ص ۹۳۳-۹۳۴ زیر عنوان: "حضرت کے معروف تلامذہ اور ان کی خدمات"

فرمایا، ان عالم صاحب نے بہت محنت اور توجہ سے مفصل حاشیہ لکھا، جس کا تخریج جزئیات و روایات کی وجہ سے، بڑا حصہ عربی میں تھا، چند توضیحات و فوائد اردو میں بھی لکھے گئے تھے، مگر افسوس کہ فتاویٰ کی ضخامت وغیرہ بہت بڑھ جانے کے خیال سے، اس قیمتی حاشیہ کو، جس میں مفتی کفایت اللہ صاحب جیسے بڑے مفتی کی نگرانی وسرپرستی شامل تھی، شائع نہیں کیا گیا۔

میں نے سنا ہے کہ یہ حاشیہ ساڑھے تین سو، پونے چار سو صفحات پر مشتمل تھا، اس کو میرے ایک بڑے علمی محسن، نہایت کرم فرما، صاحب نظر اور باذوق، حافظ توفیق احمد صاحب علوی کیرانوی رحمہ اللہ نے، کتب خانہ رحیمیہ کے وارثین کے یہاں، ایک سے زائد مرتبہ دیکھا اور وہاں سے اس کی نقل یا عکس لینے کے لئے، خاصی کوشش کی مگر وہ صاحبان آمادہ نہیں ہوئے، اور ان سطور کی تحریر کے دوران جب اس خانوادہ کے موجودہ اصحاب سے رجوع کیا گیا، تو یہ تکلیف دینے والی اطلاع ملی، کہ گھر کی نئی تعمیر کے وقت گھر میں جو علمی اثاثہ اور کتابیں وغیرہ تھیں، وہ سب مختلف افراد، اپنے اپنے ذوق کے مطابق اٹھا کر لے گئے تھے، اس لئے معلوم نہیں اس کا کیا ہوا اور کون اس کو لے گیا۔

(۲) حاشیہ، مرتبہ مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی ایک اور نسبۃً مفصل اور جامع حاشیہ، مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی [خیر آباد، اعظم گڈھ] مفتی دار العلوم دیوبند کا ہے۔ دو جلدوں اور ساڑھے گیارہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے، کمپوز ہو کر اشاعت کے لئے تیار رکھا ہے، بعض اور کام سامنے آجانے کی وجہ سے، اس کی طباعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔

(۳) حاشیہ، مرتبہ مفتی محمد یوسف صاحب [دیوبند غالباً ۱۴۲۹ھ] ایک اور حاشیہ دار العلوم دیوبند کے ایک اور استاذ، مولانا مفتی یوسف [تاؤلی، ضلع مظفر نگر] کا ہے، اس میں متوسط حاشیہ ہے، تصحیح اور مقابلہ متن کے لئے اور نسخوں کی طرح، اس میں بھی توجہ نہیں کی گئی، تاہم ہندوستان میں اس وقت تک حسن طباعت طباعت کے لحاظ سے، سب سے بہتر ہے، کمپوزنگ اور طباعت عمدہ ہے، جلد بھی خوبصورت ہے، یہ حاشیہ فتاویٰ رشیدیہ کے معروف مطبوعہ نسخہ پر مبنی ہے۔

دونوں جلدوں کے نو سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہیں، سنہ طباعت درج نہیں، اندرونی ضمنی مندرجات سے، ۱۴۲۹ھ معلوم ہوتا ہے۔

(۴) حاشیہ مطبوعہ اکوڑہ خٹک، بلاسنہ نسخہ دیوبند کے بعد ایک حاشیہ، موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور، پاکستان سے چھپا ہے، اس پر تعلیق کا کام مفتی نصیر محمد حقانی اور مفتی عبد الہادی حقانی نے، مفتی غلام قادر نعمانی کی نگرانی میں کیا ہے۔ حاشیہ نسخہ دیوبند کی طرح اوسط درجہ کا ہے، مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فقہ حنفی کے اہم مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، ضمنی ثانوی کتابوں کا تذکرہ ہے نہ حوالہ، مجموعی طور پر نسخہ دیوبند سے مفید اور بہتر معلوم ہوتا ہے۔

یہ طباعت ایک ہی جلد میں ہے، کمپوزنگ متن اور حواشی دونوں کی صاف ستھری ہے، آٹھ سو پینتیس ۸۳۵ صفحات پر مشتمل ہے، جلد کا ڈیزائن وغیرہ دلکش ہے۔

(۵) سنا ہے کہ تخریج تعلیق کا ایک اور کام کوئٹہ [بلوچستان، پاکستان] کے ایک علمی ادارہ میں ہوا ہے، اور بہ ظاہر شائع ہو چکا ہے، مگر اس کی کوئی تفصیل راقم کو دستیاب نہیں ہوئی۔

خلاصہ فتاویٰ رشیدیہ فتاویٰ رشیدیہ کے تینوں حصوں کا ایک خلاصہ بھی مرتب کیا گیا تھا، جس میں سوالات حذف کردیئے ہیں اور جوابات میں بھی تمام مندرجات کا احاطہ نہیں، مرتب نے اپنے ذوق یا شاید ضرورت کے مطابق، اہم اور ضروری ضروری جوابات ترتیب وار نقل کئے ہیں، تینوں حصوں کے منتخبات پر علیحدہ شمار درج ہے۔ یہ پورا مجموعہ یا انتخاب درمیانی پیائش کے، ایک سو پچیس صفحات پر مشتمل ہے، تحریر عمدہ صاف ستھری رواں ہے، شروع میں تینوں حصوں کی مکمل فہرست اور اختتام پر "ختم شد" کی وضاحت بھی ہے مگر کاتب و ملخص نے اپنا نام، مقام اور سنہ کتابت وتحریر رقم نہیں کیا، لیکن اس کے ساتھ شامل بعض اور تحریروں سے خیال ہوتا ہے، کہ یہ انتخاب ۱۳۵۵ھ /۱۹۳۶ء کے بعد کسی وقت ہوا ہے۔ اس کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ پر چند شبہات واعتراضات: فتاویٰ رشیدیہ اگرچہ کثرت سے چھپتا ہے، پڑھا جاتا ہے اور اس سے استفادہ کچھ کم نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس پر چند شبہات واعتراضات بھی کئے جاتے ہیں، یہاں ان کا بھی کچھ تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ کے تینوں حصے ۱۳۲۳ھ سے ۱۳۲۸ھ کے درمیان چھپے تھے، اسی وقت سے ان کو قبول عام اور کثرت استفادہ کا امتیاز حاصل ہے۔ ان فتاویٰ کی اشاعت سے تقریباً ۱۳۵۰ھ [۱۹۳۱ء] تک، ان فتاویٰ پر شبہ، یا ان کی نقل واشاعت میں بددیانتی کا خیال نہیں تھا، نہ ان کے جامع ومرتب مولانا عزیز الدین صاحب پر کوئی اعتراض کیا گیا، کوئی الزام نہیں لگایا گیا، حالانکہ اس وقت حضرت مولانا گنگوہی کے کئی سو شاگرد اور بے شمار مستفیدین موجود تھے، جن میں سے پچاسوں فقہ وفتاویٰ میں وسیع گہری نظر رکھتے تھے اور حضرت مولانا کے فتاویٰ کے طرز اور اسلوب تحریر کو خوب جانتے سمجھتے تھے، مگر کسی نے بھی فتاویٰ رشیدیہ کی اس طباعت اور اس میں شامل فتاویٰ کے، حضرت مولانا گنگوہی سے انتساب پر سوال نہیں اٹھایا، اس مجموعہ فتاویٰ کو بلا کسی تحفظ کے پڑھا گیا اور اس سے بلا تامل اخذ واستدلال بھی ہوا۔

اس مجموعہ فتاویٰ کی اشاعت کے تقریباً پچیس سال بعد، جب اس کے کم سے کم، پانچ ایڈیشن شائع ہو کر، عام ہو چکے تھے، پہلی مرتبہ یہ بات سامنے آئی کہ فتاویٰ رشیدیہ پر کامل اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور اس کے بعض فتاویٰ کی، حضرت مولانا گنگوہی

کی جانب نسبت مشتبہ ہے۔ غالباً یہ بات سب سے پہلے اس وقت کہی گئی، جب بھاول پور میں قادیانیوں کے کفر اور ان سے نکاح فاسد ہونے کا بہت اہم اور تاریخی مقدمہ چلا ہوا تھا، اس میں قادیانی جماعت کے بڑے مبلغ اور نمائندے جلال الدین شمس قادیانی نے، اپنے ایک دعویٰ میں فتاویٰ رشیدیہ کی ایک عبارت، ثبوت کے طور پر پیش کی تھی، اس کا جواب دیتے ہوئے، [اوائل ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ/ مارچ ۱۹۳۳ء میں، اس مقدمہ میں مسلمانوں کے بڑے نمائندے اور مقدمہ کے اصل پیروکار] مولانا ابوالوفاء شاہ جہاں پوری نے، فتاویٰ رشیدیہ کی علمی استنادی حیثیت پر، شبہہ ظاہر کرتے ہوئے، فتاویٰ رشیدیہ کی استنادی حیثیت سے انکار کیا تھا اور جواب دعویٰ میں لکھا تھا کہ:

۱) فتاویٰ رشیدیہ میں کچھ فتاوے ہیں، جن میں اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں اور بہت سے دوسروں کے بھی، چنانچہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے بھی، ان میں فتاوے ہیں اور مولوی لطف اللہ صاحب کے بھی۔

۲) ان کو جمع کر کے اولاً ایک غیر مقلد، عزیز الدین مرادآبادی نے شائع کرایا ہے اور غیر مقلدین کو حضرت سے خصوصی عناد تھا۔

۳) ان میں اکثر فتاوے کے متعلق اکابر علماء دیوبند برابر فرماتے رہے ہیں کہ، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نہیں، بلکہ غلط اُن کی طرف منسوب ہیں۔

۴) القاسم، الرشید وغیرہ میں، اس کے کل فتاوے نہ معتبر ہونے کا نوٹ بھی مل سکتا ہے۔(۱)

مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی نے بھی بعض جزئیات کے اضافہ کے ساتھ، اسی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ اپنے مجموعۂ فتاویٰ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

ان کی [فتاویٰ رشیدیہ] اشاعت حضرت کی وفات کے بعد، مختلف اطراف میں گئے ہوئے، خطوط کو جمع کر کے کی گئی اور ان میں ایک اختلاط یہ بھی پیش آ گیا، کہ ۱۳۱۴ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بینائی نزول ماء سے جاتی رہی تھی (تذکرۃ الرشید، ج:ا ص:۱۰۰) خود لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے، اس وقت اکثر خطوط اور فتاویٰ کا جواب، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرمایا کرتے تھے، جن میں کبھی تو حضرت بطور املاء کے الفاظ لکھواتے تھے اور کبھی مضمون بتلا دیا کہ یہ لکھ دیں۔ اس لئے جو استناد و اعتماد کا درجہ حضرت ممدوح کے فتاوے کو ہونا چاہئے تھا، اس میں ایک حد تک کمی رہ گئی۔

(۱) مقدمہ مرزائیہ بھاول پور، ص: ۱۴۴۸، جلد سوم۔ [اسلامک فاؤنڈیشن۔ لاہور: ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۸ء] جواب دعویٰ میں تین تنقیحات [Point] اور ہیں ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں، اس لئے ان کا یہاں تذکرہ نہیں کیا گیا۔

فتاویٰ رشیدیہ کے نام سے جو تین حصے شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض مسائل ایسے بھی ہیں، جن کے متعلق حضرت گنگوہی قدس سرہ کے مخصوص تلامذہ ومریدین اور خلفاء، حضرت ممدوح کے فتاویٰ، شائع شدہ فتویٰ کے خلاف نقل کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان میں ابتداء حضرت گنگوہی کا وہی فتویٰ ہو جو شائع ہوا ہے، لیکن آخر تک حاضر خدمت رہنے والے اکابر علماء نے جو نقل کیا، وہی آخری فتویٰ اور راجح قول شمار ہوگا۔

مثلاً ربوانی دار الحرب کے متعلق فتاویٰ رشیدیہ میں، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول مشہور کے موافق، دار الحرب میں کفار سے سود لینے کو جائز لکھا ہے، مگر حضرت گنگوہی قدس سرہ کے متعدد خلفاء اور حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے بارہا یہ سنا، کہ حضرت گنگوہی کا فتویٰ اس باب میں صاحبین اور جمہور کے موافق تھا، اور اسی وجہ سے حضرت ممدوح نے، حضرت حکیم الامت کے رسالہ تحذیر الاخوان پر دستخط نہیں فرمائے کہ اس کے مضمون سے حضرت کو اختلاف تھا۔ اسی طرح سماع موتے کے مسئلہ میں، جو مضمون فتاویٰ رشیدیہ میں طبع ہوا ہے، استاذی وسیدی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی دار العلوم، حضرت گنگوہی کا فتویٰ اس کے خلاف نقل فرماتے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔(۱)

ہندوستان کے ایک اور بڑے مفتی، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی کی بھی تقریباً یہی رائے تھی، جو مفتی صاحب کے حوالہ سے کئی لوگوں نے نقل کی ہے۔ مولانا بدر الحسن قاسمی نے مفتی صاحب پر اپنے ایک مضمون [کچھ یادیں کچھ باتیں] میں لکھا ہے کہ:

''فقہاء کے وا قوال جو فتویٰ کے لئے مختار سمجھے جاتے ہیں وہ ان کو اچھی طرح از بر تھے۔ دوسری طرف امداد الفتاویٰ، بوادر النوادر، فتاویٰ عبدالحئی، فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ بھی ان کی نگاہوں میں اس طرح رہا کرتے تھے کہ مسئلہ کا ذکر آتے ہی، ان کا ذہن فوراً متعلقہ صفحات کی طرف منتقل ہو جاتا، پھر مثال کے طور پر فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ عزیزیہ کی تدوین کے دوران مرتبین کی طرف سے جو تھوڑی بہت کمی بیشی کی گئی ہے اور جس کی وجہ سے بعض مسائل میں، ان کے درجہ استناد میں فرق آیا ہے'' (۲)......(۳)

مفتی صاحب اس گفتگو میں، مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری [سابق مفتی دار العلوم، دیوبند] کا بھی نام لیا کرتے تھے۔

خود میں نے ایک مرتبہ مفتی صاحب سے عرض کیا کہ، اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے، فرمایا:

دار الافتاء [دار العلوم] میں فتاویٰ رشیدیہ کے ایک پرانے چھپے ہوئے نسخہ پر، مولانا محمد سہول صاحب کی تحریر ثبت ہے۔

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم [امداد المفتین] فتاویٰ مولانا مفتی محمد شفیع۔ مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع ص: ۶ جلد دوم [دار المعارف، کراچی: ۱۳۸۴ھ]

(۲) ماہنامہ الفرقان لکھنؤ۔ [فروری ۱۹۹۷ء۔ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ۔ جلد: ۶۵۔ شمارہ: ۲]

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

راقم فوراً دارالافتاء گیا اور وہاں، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کی عنایت وتعاون سے، دارالافتاء میں موجود فتاویٰ رشیدیہ کے تمام نسخوں کو توجہ اور تفصیل سے دیکھا، اگرچہ دارالافتاء میں طبع اول سے، مطبوعہ رحیمیہ دہلی ودیوبند تک، تقریباً تمام نسخے موجود تھے، مگر وہ نسخہ نہیں ملا، جس پر مولانا محمد سہول کی تحریر تھی، یہ بات میں نے واپس آکر، مفتی صاحب سے عرض بھی کردی تھی، اور [یہ نسخہ اب تک دریافت نہیں ہوا، اللہ جانے کہاں گیا]۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا

(۳) حضرت مفتی محمود حسن صاحب سے منسوب اس روایت میں فتاویٰ رشیدیہ کے علاوہ فتاویٰ عزیزیہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لئے [اگرچہ میری جسارت وگستاخی شمار ہوگی مگر] فتاویٰ عزیزیہ کے متعلق بھی چند پہلوؤں کا تذکرہ غیرہ مفید نہ ہوگا۔

فتاویٰ عزیزیہ: حضرت شاہ صاحب کی حیات میں مرتب ان مجموعوں پر مشتمل ہے، جن میں حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ نے، حضرت شاہ صاحب کے فتاویٰ اور مسائل نقل اور یکجا کیے تھے۔ اس قسم کے متعدد مجموعے اب تک موجود ہیں، ان میں سے ایک مختصر مجموعہ ایسا بھی ہے، جو خود حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے ایک شاگرد کو عطا فرمایا تھا [یہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے] اور بھی کئی نسخے ہیں، ان میں ایک بڑا اور اہم نسخہ، جو حضرت شاہ صاحب کی وفات کے صرف تین سال بعد ۱۲۴۲ھ میں مرتب ومکمل ہوا ہے، راقم کی نظر میں ہے اور اس کا فوٹو اسٹیٹ بھی ہمارے ذخیرہ میں ہے، اس کے علاوہ اور بھی کئی قلمی نسخے ہند پاکستان اور مغربی ملکوں کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

فتاویٰ عزیزی کا معروف مطبوعہ نسخہ سب سے پہلے ۱۳۱۱ھ [۱۸۹۴ء] میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا تھا [بعد کی تمام طباعتیں اسی کی نقل ہیں] اور جیسا کہ اس طباعت میں تصریح ہے، اس کا قلمی نسخہ مولانا خلیل الرحمن برہان پوری کے ذخیرہ سے حاصل ہوا تھا، اس کی تصحیح اور مقابلہ کی خدمت، مشہور عالم، مصنف، مترجم، محقق اور ناشر، مولانا محمد احسن نانوتوی [برادر حقیقی مولانا محمد مظہر نانوتوی، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے عم زاد تھے] نے انجام دی تھی اور اس نسخہ کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے خانوادہ کے حالات مولانا محمد بیگ دہلوی نے مرتب کئے تھے، جو خاندان ولی اللہی کے نہایت قریب اور دہلی کے ممتاز اہل علم تھے، اس لئے اس نسخہ میں: ''مرتبین کی طرف سے تھوڑی بہت کمی بیشی کی بات'' حیرت انگیز ہے۔

راقم کے پاس فتاویٰ عزیزیہ کا جو قدیم ترین نسخہ [عطا فرمودہ حضرت شاہ عبدالعزیز] اور دوسرے نسخوں کے فوٹو اسٹیٹ ہیں اور راقم نے ان میں سے متعدد تحریرات وفتاویٰ کا مجتبائی کی طباعت سے مقابلہ کیا ہے، ان میں کوئی فرق اور تحریف وتغیر کا نشان نہیں ملا، اور اگر مولانا محمد احسن نانوتوی جیسے بلند مرتبہ علماء پر بھی تحریف وتصحیف یا دانستہ کمی بیشی کی بات کہی جائے گی الزام لگایا جائے گا، تو باقی کیا رہے گا۔ کونسا عالم اور مصحح ایسا ہوگا جس کی شائع کی ہوئی کتابوں پر اعتماد کیا جائے گا، یہاں یہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ مولانا محمد احسن کا اکابرین دیوبند میں شمار ہے، اور وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی اعلیٰ ترین تصنیفات کی تصحیح وتعلیق کے علاوہ، علوم شرعیہ اسلامیہ کی بیسوں اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے ایسے نادر روزگار مصحح وناشر ہیں کہ ان کی شائع کی ہوئی کسی ایک کتاب پر بھی، آج تک تحریف وتصحیف یا دانستہ کسی علمی کوتاہی کا الزام نہیں لگا اور مولانا کی شائع کی ہوئی اکثر بنیادی کتابیں، اب تک نہایت معتبر اور گویا متن کی تصحیح کے لحاظ سے سند سمجھی جاتی ہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، ان ہی دونوں اکابر، حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت مولانا گنگوہی کو فقیہ النفس، فرماتے ہیں اور عجب سوئے اتفاق ہے کہ ہمارے یہاں، ان ہی دونوں کے مجموعہائے فتاویٰ کے متعلق شبہات ظاہر کئے جاتے ہیں، حال آں کہ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت علامہ کے سامنے بھی فتاویٰ عزیزیہ اور فتاویٰ رشیدیہ کی یہی اشاعتیں اور نسخے رہے ہوں گے، جن کی بنیاد پر حضرت علامہ کشمیری نے وہ بڑا فیصلہ کیا اور متاخرین نے یہ کہہ دیا کہ ان پر اعتماد ہی نہیں کیا جاسکتا۔

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا؟

ان دونوں مجموعوں کے بعض مسائل وفتاویٰ کا خصوصاً متاخر فقہائے احناف کی رائے سے مختلف ہونا اور بات ہے، محرف اور غیر معتبر ہونا اور۔ میرا ناقص خیال ہے کہ دوسری بات سے اتفاق صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

غریب شہر سخن ہائے گفتی دارد درج بالا اطلاعات، بڑے علماء اور جلیل القدر مفتیان کرام کے ارشادات ہیں، لیکن جب کوئی معمولی طالب علم ان کو پڑھتا، استفادہ کرتا ہے اور قدیم فتاویٰ رشیدیہ کو دیکھتا ہے، تو چند سوالات اس کے سامنے آتے ہیں، جو جواب چاہتے ہیں۔

مولانا ابوالوفاء صاحب کے ارشادات کی نوعیت تو الزامی جواب کی ہے، مقدمہ و مناظرہ میں، فریق مخالف کو خاموش لاجواب کر دینا، اصل مقصد ہوتا ہے، کسی بات کے سوفیصد صحیح ہونے اور علمی تحقیق سے، اس کی مکمل مطابقت ضروری نہیں سمجھی جاتی، اس لئے مولانا کے فرمودات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی، تاہم چند گوشے توجہ طلب ہیں:

(۱) کیا مولانا ابوالوفاء صاحب کے ارشادات صحیح اور بہر حال لائق اعتماد ہیں۔

(۲) فتاوی رشیدیہ کا کم سے کم پہلا حصہ، حضرت مولانا گنگوہی کی حیات میں مرتب و مکمل ہو کر، طباعت کے لئے تیار ہو گیا تھا، حضرت کے اکثر خواص اور منتسبین کو اس کی ترتیب وطباعت کا علم تھا، خود حضرت مولانا بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے۔

(۳) فتاویٰ رشیدیہ میں کچھ [یعنی گنتی کے چند] نہیں، مجموعی طور پر، تقریباً بارہ سو فتاویٰ شامل ہیں، جو سوفیصد حضرت مولانا کے، یا حضرت مولانا کے نائب اور کاتب، مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی کے لکھے ہوئے ہیں۔ مولانا لطف اللہ علی گڈھی وغیرہ، علماء کے جو فتوے آئے ہیں، وہ تمام ضمناً یا تصدیق کے لئے، یا تنقیح و تصحیح کے لئے آئے ہیں، ان کو اصل فتاویٰ میں شمار کرنا، کسی طرح بھی درست نہیں۔

(۴) مولانا عزیز الدین صاحب کا، حضرت مولانا گنگوہی سے طویل رابطہ اور ارادت تھی اور اس وقت تک، ان پر غیر مقلدیت کا کچھ اثر نہیں تھا اور نہ ہی مولانا کو، اصحاب تقلید اور حضرت مولانا سے [خدانخواستہ] خصوصی عناد تھا۔ یہ تعبیر قطعاً بے محل ہے۔

(۵) ماہنامہ القاسم اور الرشید میں، اس مجموعہ فتاویٰ کے غیر معتبر ہونے کا حوالہ اب تک دستیاب نہیں ہوا۔(۱)

اگر چہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے، کمال دیانت کا اظہار کرتے ہوئے متعلقہ روایات نقل کر دی ہیں، مگر واللہ اعلم بحقیقۃ الحال لکھ کر، ان اطلاعات پر خواہی سوالیہ نشان بھی لگا دیا ہے، کہ حقیقت کی جستجو باقی ہے، اس لئے اس سلسلہ میں بھی، چند معروضات پیش ہیں۔

(۱) ماہنامہ القاسم [دور اول] ۱۳۲۸ھ [۱۹۱۰ء] میں دارالعلوم کے اجلاس دستار بندی کے موقع سے شائع ہونا شروع ہوا تھا، جو بارہ سال تک متواتر چھپتا رہا، اس کے سب سے پہلے نمونہ کے شمارہ سے، آخری جلد تک تمام شمارے بہ مکمل ہیئت راقم کے ذخیرہ میں ہے، اس میں ایسی کوئی تحریر نظر میں نہیں آئی، اسی طرح الرشید کے بھی اکثر شمارے اور تمام مضامین راقم کی نظر سے گزرے ہیں، اور ان کا بھی بڑا حصہ ہمارے ذخیرہ میں ہے مگر ان میں بھی یہ اطلاع نہیں ملی۔

(۶) حضرت مولانا گنگوہی نے اگرچہ ۱۳۱۴ھ میں درس حدیث کا سلسلہ ختم فرمادیا تھا، اس وقت کثیر مصروفیات کے علاوہ، بینائی بھی کسی قدر متاثر ہوگئی تھی مگر یہ اطلاع صحیح نہیں، کہ حضرت نے اس وقت فتاویٰ لکھنے بھی ترک کردیئے تھے، حضرت کے اپنے قلم سے ۱۳۱۷ھ تک کے لکھے ہوئے فتاویٰ معلوم ہیں، (۱) اس کے بعد اپنی مہر مولانا محمد یحییٰ کے سپرد فرمادی تھی۔

(۷) حضرت گنگوہی کے فتاویٰ میں، فتاویٰ مکتوبہ مولانا محمد یحییٰ کی وجہ سے، اعتماد واستناد کی کمی کی بات بھی حیرت انگیز ہے، کیونکہ مولانا یحییٰ صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے جو فتوے، فتاویٰ رشیدیہ میں شامل کئے گئے ہیں، ان میں سے ہر اک پر: ''بقلم مولانا محمد یحییٰ'' کی صراحت ہے، جو اس کی بھی علامت ہے کہ اس میں حضرت مولانا یحییٰ کے مکتوبہ، صرف یہی فتوے ہیں، جن پر مولانا کا نام لکھا ہوا ہے۔

اور اگر مولانا محمد یحییٰ صاحب کے علاوہ حضرت کے کسی اور شاگرد کے قلم کا لکھا ہوا ہے تو مولوی عزیز الدین صاحب نے موقع پر اس کی تصریح کردی ہے کہ یہ فتویٰ فلاں کے قلم کا مکتوبہ ہے۔

(۸) حضرت مولانا گنگوہی کے وہ فتاوی، جو فتاویٰ رشیدیہ میں درج فتاویٰ کے خلاف ہیں اور وہی معتمد ہیں، کیا یہ فتاویٰ موجود ہیں؟ کسی دیکھنے والے نے ان کا معتبر متن نقل کیا ہے، کیا وہ کہیں محفوظ ہے؟ اگر نہیں، تو اس صورت میں روایت معتبر ہوگی یا وہ تحریر، جو موجود ہے؟

(۹) نیز جب مرتب فتاویٰ رشیدیہ، مولانا عزیز الدین صاحب اس کے، حصہ اول کی اشاعت کے وقت سے، تینوں حصوں کی اشاعت کے ساتھ اور اس کے بعد بھی، تقریباً دس سال تک، مسلسل یہ اعلان کرتے رہے، کہ ان تمام فتاویٰ کی اصل میرے پاس موجود ہے، جس کو بھی شک ہو، یا مزید اطمینان حاصل کرنا چاہے، وہ بلا تأمل آکر دیکھ سکتا ہے، تو لمبے عرصہ تک مسلسل اعلان واطلاع کے باوجود، اصل فتاویٰ سے رجوع کی، کیوں زحمت نہیں کی گئی، [حال آں کہ وہ جملہ فتوے ۱۴۰۰ھ کے بعد تک موجود محفوظ رہے] اس کی وجہ سے ان فتاویٰ سے شک وشبہ بھی ختم ہوجاتا اور بعد میں ان موضوعات کے جو اور فتوے، مطبوعہ فتاویٰ سے مختلف بیان کئے جاتے ہیں، ان کے زمانۂ تحریر اور راجح مرجوح کا قضیہ بھی طے ہوجاتا ہے۔

---

(۱) اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کو جو اجازت وسند عطا ہوئی، اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ۱۳۱۹ھ [۱۹۰۲ء] تک خود لکھتے تھے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے: حررتہ لتاسع ذی الحجۃ من الشہر المنتظم فی سنۃ الف وثلاثمائۃ وتسع عشرۃ من الہجرۃ. نفحۃ العنبر ص: ۲۹۵

(۱۰) ایک اور پہلو بھی توجہ طلب معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حضرات، جو حضرت مولانا گنگوہی کے خاص تربیت یافتہ تھے، خصوصاً فقہ وفتاوی میں حضرت مولانا کے نمائندہ اور جانشین سمجھے جاتے تھے، ان میں سے کسی ایک سے بھی، ان فتاوی کے عدم استناد یا مشتبہ ہونے کی کوئی روایت منقول نہیں، اس سلسلہ میں خصوصاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی [سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند] کے نام سرفہرست ہیں، جو فقہ وفتاوی میں حضرت مولانا کے خاص تربیت یافتہ تھے، ان حضرات نے اس سلسلہ میں کوئی اظہار خیال نہیں فرمایا، بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے، مرتب فتاوی، مولانا عزیز الدین صاحب سے فتاوی رشیدیہ کے حقوق خرید کر، دارالعلوم کی جانب سے، اپنے مطبع قاسمی دیوبند سے، ان کی نئی عمدہ طباعت کا اہتمام کیا۔ اس وقت اس کا سب سے بہتر موقع تھا، کہ اس مجموعہ فتاوی کی استنادی حیثیت پر گفتگو کی جاتی، یا اس کا اشارہ کر دیا جاتا، مگر اس اشاعت میں ایسا کوئی تذکرہ موجود نہیں۔

ان وجوہات سے فتاوی رشیدیہ کی ترتیب واستناد کے حوالہ سے، درج بالا عنوانات ومباحث کی تحقیق وتنقیح نہایت ضروری ہے، اس سے پہلے اس مجموعہ فتاوی کے حوالہ سے غیر مستند ہونے کا فیصلہ صادر کرنا، غالباً مناسب نہ ہوگا۔

جسارت کی معافی چاہتے ہوئے، یہاں ایک بات اور عرض کردینی چاہیے:

جب ہمارے تمام بڑے جلیل القدر علماء، فقہاء، محدثین اور جملہ اہل فتوی اس کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ، حضرت مولانا گنگوہی، تفقہ اور دقت نظر میں علامہ ابن عابدین شامی اور ان کے ہم عصر علماء سے، بہت فائق اور ممتاز ہیں، نیز تفقہ اور فہم مسائل میں، حضرت مولانا، علامہ ابن ہمام اور علامہ ابن نجیم کی صف کے دیدہ ور فقیہ اور اسی مقام ومرتبہ کے شخص ہیں، تو حضرت مولانا کے لکھے ہوئے مسائل کی، شامی اور فقہائے متاخرین کی جزئیات اور اطلاعات سے مطابقت کیوں ضروری سمجھی جاتی ہے؟

حضرت مولانا نے زبدۃ المناسک کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کے لئے ردالمحتار (شامی) مقدمہ اور خاتمہ فتح القدیر اور عالمگیری سے استفادہ کیا ہے، لیکن اس کے بعد جو ایک فقرہ تحریر فرمایا ہے، وہ نہایت اہم ہے، فرماتے ہیں: "اگر کہیں مخالف پائیں جلدی سے غلطی پر حمل نہ فرمائیں" (۱) اس ایک مختصر سے فقرہ میں حضرت مولانا نے بہت کچھ کہہ دیا یعنی اگرچہ تمام مراجع میرے سامنے ہیں اور میں نے ان سے اخذ واستفادہ کیا ہے مگر بعض موقعوں پر میری رائے ان

سے مختلف ہے اور بلا تحقیق میری اس رائے یا اختلاف کو غلطی پر مبنی نہ سمجھیں۔ اس طرح کے فقرے حضرت کے اور بھی متعدد فتاویٰ میں موجود ہیں، ایک جگہ لکھا ہے: ''اگرچہ فقہاء نے اس کا تذکرہ نہیں کیا مگر میں کہتا ہوں، ایک اور جگہ ہے: ''اگرچہ فقہاء نے یہ بات کہی ہے مگر غلط ہے، امید ہے کہ صاحب نظر قارئین زیر نظر مجموعہ میں اس قسم کے اور بھی الفاظ وکلمات پڑھیں گے، یہ بات حضرت مولانا کے تمام فتاویٰ پر بھی صادق آتی ہے۔ حضرت مولانا کئی موقعوں پر فقہائے کرام اور معروف فقہی جزئیات سے اختلاف فرماتے ہیں مگر اس کا بہت واضح اظہار نہیں کرتے، صرف اپنی رائے یا فتویٰ لکھ دیتے ہیں، اسی میں حضرت مولانا کا فقہی تعمق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ صحیح بخاری کے بارے میں ائمہ محدثین کا ارشاد ہے: ''فقه البخاري في تراجمه'' اسی طرح حضرت مولانا کی شان تفقہ کا، ان ہی اختلافی فیصلوں اور جزئیات میں مشاہدہ کیا جانا چاہئے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا، کہ حضرت مولانا گنگوہی کے اس مجموعہ فتاویٰ کو خاص توجہ اور گہری نظر سے بار بار پڑھ کر، اس کا بہتر تجزیہ کیا جاتا، جو مسائل فقہائے متاخرین کے مطابق نہیں ہیں، ان کی وجہ تلاش کی جاتی اور تالیفات سے، فقہی اصول اخذ کئے جاتے (۲) ان کو نئے مسائل ومباحث کے حل کرنے میں رہنما اور اساس قرار دے کر، اسی نہج پر اور مسائل حل کرنے کی کوشش ہوتی، حضرت گنگوہی کی فقہی فکر اور نظریہ کو آگے بڑھایا جاتا، اس کے لئے متقدمین کی کتابوں سے دلائل وتوثیق فراہم کی جاتی، حضرت مولانا نے جو متعدد مسائل میں، بالکل نئے مگر نہایت محکم استدلال کئے ہیں، ان کی معنویت کیا ہے، اس پر غور وفکر کیا جاتا، حضرت مولانا نے متعدد مسائل میں حنفی مسلک سے تجاوز کرتے ہوئے، جو فتاویٰ صادر کئے اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کی اور اس سمت میں رہنمائی فرمائی، مثلاً جس کا شوہر غائب ہو، مالکیہ کے فتوے کے مطابق چار سال بعد، اس کا فسخ نکاح اور دوسرے نکاح کی اجازت، جس کو حضرت مولانا تھانوی نے ''الحيلة الناجزه للحليلة العاجزه'' میں مرتب ومدون فرمایا ہے اور برصغیر ہند میں تمام احناف کے یہاں اسی پر عمل ہے۔ یہ دراصل حضرت مولانا گنگوہی کی ہی فکر ہے جو ان کو ان کے اساتذہ [خصوصاً مفتی صدرالدین آزردہ] اور خاندان کے علماء [مولانا قاضی سراج الدین گنگوہی] وغیرہ سے ملی تھی، حضرت مولانا گنگوہی اس پر عمل بھی کیا اور اس کے مطابق فتوی دینے کی ہدایت بھی فرمائی۔

اسی طرح حضرت مولانا کی، مولانا تھانوی کو یہ ہدایت ووصیت کہ معاملات کے جن مسائل میں، احناف کے یہاں کم گنجائش ہے مگر لوگ عموماً اس میں مبتلا ہیں، ان میں دوسرے مسلک کے مطابق، جس میں گنجائش اور جواز ہے، فتویٰ دے

---

(۱) حضرت مولانا کی مختصر تالیف سبیل الرشاد اور رسوم وبدعات کی تحقیق وحقیقت پر وہ مراسلت، جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے ہوئی تھی، اس میں خاص مددگار ہوسکتی ہیں۔

(۲) ملاحظہ ہو زبدۃ المناسک، باہتمام مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، [بلالی اسٹیم ساڈھورہ] نیز زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک از مولانا شیر محمد صاحب سندھی، ص:۱۶، [دارالاشاعت کراچی: ۱۹۶۳ء]

دینا چاہئے۔ اور بھی کئی گوشے اور کئی عنوانات و مباحث ایسے تھے، کہ ان پر حضرت کی تحریرات و فتاویٰ کی روشنی میں، تحقیق اور نئے مسائل کی جانب پیشرفت کی جاسکتی تھی۔

مگر ہمارے یہاں آج تک، حضرت مولانا کی شان تفقہ، طریقہ استخراج مسائل اور ان مباحث و متعلقات پر کوئی قابل ذکر کام ہی نہیں ہوا، اور جب حضرت مولانا کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تحقیق تلاش اور طباعت کے مسئلہ پر ہی ہم نے کوئی قدم نہیں بڑھایا، کوئی کوشش نہیں کی تو دوسرے عنوانات کی جانب کس طرح پرواز ہوسکتی تھی اور عجب نہیں کہ ہمارے محبت و تعلق کے اس دعوے کو، جو کبھی کبھی "عشق سعدی تا بہ زانو" کا مصداق معلوم ہوتا ہے دیکھ کر حضرت مولانا کی روح ہم جیسے نام لیواؤں کو مخاطب کر کے یوں کہتی ہو:

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو کچھ بھی نہ ہوسکا!

افسوس!

آخر میں عرض ہے کہ حضرت مولانا کی ذات گرامی اور ان فتاویٰ پر لکھنے کے لئے، راقم کے سامنے جو اطلاعات و معلومات تھیں، زیر نظر صفحات میں ان کا کچھ حصہ آیا ہے۔ جو کچھ اس وقت تک راقم سطور کے سامنے ہے، اگر اس سب کو مرتب کر کے پیش کیا جائے، تو امید ہے کہ ان شاء اللہ ڈھائی سو، پونے تین سوصفحوں کی کتاب ہوگی لیکن ظاہر ہے کہ یہاں اس کا موقع نہیں تھا، اس لئے اسی قدر قلیل پر اپنی اس تحریر کو ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ان شاء اللہ حضرت پر کسی وقت ایک مستقل کتاب شائع کی جائے گی۔

وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

نورالحسن راشد کاندھلوی

۲۰/ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ